حصۂ اوّل

لکھنؤ اور دھلی ریڈیو اسٹیشنوں سے علمی
دینی، ادبی ۳۳ نشری گفتگوؤں کا مجموعہ

از

عبدالماجد دریابادی

اڈیٹر صدق جدید لکھنؤ و مصنف حکیم الامت، محمد علی کی ڈائری
اور انشاء ماجد اول و دوم وغیرہ

قیمت

تین روپے پچاس نئے پیسے

ناشر

نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

ٹیلیفون ۲۴۵۵۹

پبلشر:۔ عزیز الرحمٰن

پرنٹر:۔ نامی پریس لکھنؤ

فہرست نشریات

دیباچہ

ریڈیو کوئی خانگی ادارہ نہیں، ایک ملک گیر سرکاری محکمہ کا نام ہے، جس طرح ریل، تار ڈاک وغیرہ باضابطہ محکمے ہیں۔ یہ محکمہ اپنے ہاں سے تقریریں نہیں، تحریری گفتگوئیں نشر کرتا رہتا ہے۔ اور ان کے لئے ملک کے مختلف شعبوں کے اکابر و مشاہیر کو دعوت دیتا رہتا ہے۔ "تقریر" کے لفظ سے سماں یہ بندھتا ہے، کہ اپنے سے کمتروں کا ایک مجمع سامنے ہے، اور کوئی قابل تر، فاضل تر، مقرر انھیں مخاطب کر رہا ہے، انھیں کچھ سکھا رہا ہے۔ ریڈیو کا محکمہ 'تقریر' (SPEECH) نہیں چاہتا۔ وہ صرف گفتگو (TALK) چاہتا ہے۔ بات چیت جو بغیر کسی ضابطہ اور تکلف کے، بے تکلف دوستوں عزیزوں کے درمیان ہوتی ہے اور ساتھ ہی بولنے والے کے لفظ لفظ کی ذمہ داری بھی محکمہ اپنے ہی سر رکھتا ہے۔

اس لئے لامحالہ وہ "گفتگو" پہلے سے قلمبند ہوجانا چاہیئے۔ تاکہ ریڈیو گھر کے افسر اس کی پہلے سے چھان بین کرلیں کہ کہیں کوئی بات کسی مصلحت سرکاری کے خلاف تو زبان سے نہیں ادا ہورہی ہے۔

یہ "تحریری گفتگو" ہے ذرا ایک غیر طبعی سی چیز اور اس لئے اس کی فرمائش ہے بڑی سخت۔ گفتگو جب ضبط تحریر میں آگئی تو گفتگو وہ رہی کہاں، بے تکلفی کا ماحول ہی جب بالکل بدل گیا تو بے تکلفی پیدا کہاں سے ہوسکتی ہے۔ کاغذ پر لے آنے کے بعد تو یقیناً وہ تحریر ہوگئی اور اس کے ڈانڈے تمامتر مقالہ یا مضمون سے مل گئے! — یہی سبب ہے کہ اکثر نشریے بالکل لکھے لکھائے مقالے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ پردہ کی آڑ سے پڑھ کر کہیں سنادیئے گئے ہیں۔ اور اچھے اچھے اہل قلم واہل علم مائکروفون پر جاکر بالکل "بور" ثابت ہوتے اور (TALKER) یا "باتونی" کی حیثیت سے صفر محض نکلتے ہیں۔ لکھنے اور بات کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور تحریر کی زبان بول چال سے بالکل الگ ہوتی ہے۔

گلشن کی زباں اور ہے صحرا کی زباں اور
بلبل کی فغاں اور ہے عاشق کا بیاں اور

منجھے ہوئے اہل قلم قدرتاً اس فرق کو بھول جاتے ہیں۔

اِدھر قلم ہاتھ میں آیا کہ اُدھر زبان قلم پر بے اختیار وہی ترکیبیں وہی بندشیں آنے لگیں جو تحریر و انشا کی جان سمجھی جاتی ہیں اور گفتگو کی بے تکلفی اور آمد ساری کی ساری تشریف لے گئی! یہ ہونا کچھ ناگزیر سا ہے، اور اس کے برخلاف کی توقع رکھنا پیر اک سے یہ فرمائش کرنا ہے کہ غوطہ تو لگائے جاؤ لیکن دیکھو کپڑا نہ بھیگنے پائے!

اندرونِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ
بازمی گوئی کہ داماں تر مکن ہشیار باش

اور خیر دوسروں کی عیب جوئی کیوں کی جائے خبر اپنی ہی کیوں نہ لی جائے؟ کوشش و اہتمام کے باوجود "تقریر" یا "گفتگو" بار بار تحریر بن بن گئی ہے۔ خصوصاً جب کبھی ایسے موضوع پر بولنا ہوا کہ جو اپنا پسند کیا ہوا نہیں، بلکہ تمامتر محکمہ کی طرف سے فرمائشی تھا۔

ناشر (BROAD CASTER) کو قدرت اپنے لب و لہجہ پر خاص طور پر ہونی ضروری ہے۔ آواز کا کہیں اتار، کہیں چڑھاؤ، کہیں گھٹاؤ، کہیں بڑھاؤ، کہیں بہاؤ، کہیں ٹھہراؤ، سب ایسا ہونا چاہئے جس سے سننے والے پر اثر پڑے، تو یہ پڑے کہ پسِ پردہ کوئی زندہ ہی بول رہا ہے، بات چیت کر رہا ہے، نہ یہ کہ سر جھکائے، زور لگا لگا کر کوئی کتابی آموختہ سنا رہا ہے — کتابی زبان

کے ضابطے قاعدے ہی کچھ اور ہیں اور بولنے چالنے والے کے تیور ہی کچھ اور۔

مرد ایں رہ را نشانِ دیگر ست

محکمہ از راہ ذرہ نوازی سالہا سال سے اس بے علم و ہیچمدان کو بھی نواز رہا ہے۔ اور علاوہ اپنی لسانی کمیٹیوں وغیرہ میں رکھنے کے بارہا دعوتِ گفتگو دے چکا ہے، کبھی کسی دینی عنوان پر، کبھی کسی شاعر کے کلام پر، کبھی یوں ہی کسی بے بات کی بات پر۔ تعمیل برے بھلے، بہرحال کردی گئی۔ اس ۱۵ سال کے عرصہ میں ان نشریوں کا مجموعہ خاصی ضخامت کا ہوگیا۔ فرمائشیں شروع ہوئیں کہ اسے یک جا کرکے چھاپ دیا جائے۔ چنانچہ محکمہ مذکور سے اجازت لینے کے بعد اس فرمائش کی تعمیل کی جا رہی ہے۔

ان عنوانات کی بڑی تعداد مذہبی ہے۔ ان دینی موضوعوں پر جو کچھ اور جس حد تک بھی ممکن تھا، اپنی بساط کے اندر عرض کردیا گیا ہے۔ اور شاید تبلیغ کا حق کسی نہ کسی درجہ میں ادا ہی ہوگیا ہے۔ اس کے بعد تعداد ادبی عنوانات کی ہے۔ یہاں بھی اکثر (ہمیشہ نہیں اکثر) دل میں آئی ہوئی زبان پر بھی آگئی ہے۔ سب سے ٹیڑھی کھیر وہ عنوان معلوم ہوئے جو کچھ نیم سیاسی سے تھے یا قومی، علمی دلی مسائل سے متعلق۔ یہاں بڑی گھٹن محسوس ہوئی۔ اور

دل کے محسوسات اور سرکاری مصلحتوں کے درمیان
ہم آہنگی ہر جگہ آسان نہ رہی۔ ع
جو لچے بہت تو بچے ذرا جو کھری کہی تو دھرے گئے

بہرحال جو کچھ بھی بن پڑا حاضر ہے۔
فنی اعتبار سے نفس خود بیں کو اگر کچھ پسند آئے
ہیں تو ذیل کے پانچ نشریے :-

یہ نشریئے زیادہ تر اپنے ہی شہر لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئے۔ چند بار دہلی ریڈیو اسٹیشن نے عزت افزائی کی۔ شروع میں دو بار وہاں جانا پڑا۔ اس کے بعد "گفتگو" ہی لکھنؤ میں ریکارڈ ہو کر دہلی سے نشر ہونے لگی۔ ایک بار محض مسودہ دہلی منگا لیا گیا ("شکوہ جواب شکوہ")۔ اور ایک نشریہ ایسا بھی ہے جسے دہلی کے بعد کشمیر ریڈیو نے دوبارہ نشر کیا ("شوق قدوائی بہ ۔ مثنوی گو۔)
فرمائشیں قدرتاً شعبہ اردو ہی کی طرف سے ہوتی رہیں۔
لیکن ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے شعبہ ہندی ۔ نے دعوت اردو گفتگو کے لئے دی ("ینگی کر

اور دریا میں ڈال")

ایک بار دہلی ریڈیو اسٹیشن نے انگریزی میں مختصر تبصرہ عبداللہ یوسف علی کے انگریزی ترجمۂ قرآن پر طلب کیا تھا۔ لکھ کر بھیج دیا گیا۔ اور وہیں سے نشر ہوا۔ وہ قدرتاً اس مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ اسی طرح لاہور ریڈیو اسٹیشن نے بھی تقسیم ملک سے قبل یوم النبی پر کوئی تحریر طلب کی تھی وہ بھی اس مجموعہ میں داخل نہیں۔

یہ جلد وسط سنہ ۱۹۵۴ء پر ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد کے نشریئے انشاءاللہ جلد دوم میں نظر آسکیں گے۔

دریاباد۔ بارہ بنکی
۱۷ر مئی سنہ ۵۴ء

عبدالماجد

(۱) ہماری زندگی اور اس کے رنگ ڈھنگ

ہوٹل سے بھلا پرہیز تمھیں اب پنڈت جی مہراج کہاں
سچ بات کہی جس نے یہ کہا جب لاگ لگی تب لاج کہاں

نگاہوں سے دور اور آنکھوں کی پتلیوں سے مستور۔۔ لیکن دل کی آنکھوں کے پاس، اور جسم تصور کے لیے بمنزلۂ لباس، سننے والے بھائیو! اور سننے والی بہنو!

زمانہ کی نیرنگی اور کارخانۂ دہر کی عجائب کاری کہ "سوسائٹی" کے مضمون پر بولنے وہ کھڑا کیا گیا ہے، جو شہر چھوڑ، خود ایک ویرانہ میں پڑا ہے! اور آپس کے میل جول کی رنگارنگی پر زبان کھولنے وہ اٹھا ہے جو خود سب سے الگ تھلگ، گوشہ نشینی کی کملی سے چمٹا ہوا ہے!۔۔۔ زنگی کا نام کافور، اناڑی کے ہاتھ میں بندوق۔ ریڈیو کے عجائب زار میں ایک اور اعجوبہ کا اضافہ۔

فطرت ٹھیٹھ مشرقی، تعلیم ملی تو کچھ مغربی سی، آنکھ کھلی مشرق کے صحن و دالان میں، عقل و خرد نے ہوش سنبھالے مغرب کے پارک اور میدان میں۔ جوانی

۱؎ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن۔ ۹ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کی شام کو۔ وقت۔ ۱۵ منٹ۔

آخر دیوانی۔ یہ دیوانگی ہمیشہ شعر و غزل ہی کے سایہ میں نہیں پلتی، اور افسانہ اور رومان ہی کی سرزمین پر نہیں جڑ پکڑتی کبھی شدت فرزانگی کے روپ میں بھی جلوہ دکھاجاتی ہے۔ دل طلسم فرنگ کا مفتوں۔ اور دماغ لیلائے مغرب کا مجنوں! مدتوں، مل اور اسپنسر، ہیوم اور ہکسلی سر پر سوار رہے، اور برسوں آنکھ لڑی رہی ریشنلزم (عقلیت) سے اور اگناسٹی سزم (لاادریت) سے نشہ آخر کار اترا، اور تب چھوٹا ہوا گھر یاد آیا —— گھر! ہاں وہی مشرقی گھروندا۔

ہاں وہی مشرق، جہاں ہر صبح مسجدوں میں وضو ہوتے ہیں اور دریاؤں میں اشنان۔ جہاں ہر شام مسجدوں میں اذانیں ہوتی ہیں، اور مندروں میں گھنٹے بجتے ہیں۔ جہاں صبح، آفتاب نکلنے سے پہلے ہی شروع ہوجاتی ہے، اور جہاں شام دن چھپنے کے ساتھ ہی آجاتی ہے۔ جہاں یہ نہیں ہوتا کہ سائنس کا کمال رات کو دن بنادے اور آرٹ کی "جنت نگاہ" دن میں رات کے سارے مزے بھردے یہ وہ زمین ہے، جس پر کبھی آسمان کو بھی ناز رہ چکا ہے۔ نبی اور ولی، اور بڑے بڑے رشی اور گیانی، کسی زمانہ میں اسی زمین پر پھلے پھولے، رہے، بسے ہیں۔ اور آج بھی اپنے اپنے طریق پر خدا جانے کتنے ذکر و فکر کے حلقوں کو بسائے اور گیان دھیان کی سمادھیوں کو رچائے ہوئے ہیں۔ یہ وہ خطہ ہے جہاں اب تک عزت ہو رہی ہے برقعے اور گھونگھٹ کی نقاب اور چادر کی جہاں اب تک شوہر کو سرتاج اور سوامی کہا جاتا اور باپ کو قبلہ و کعبہ لکھا جاتا ہے!

یہاں والوں کا اب تک یہ عقیدہ ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اور ماں کو ادب کے ساتھ سلام کرنا، اس کے قدموں سے آنکھیں ملنا،

دستور میں داخل ہے۔ اولاد کا سلسلہ پیدائش روکنے کی جگہ یہاں اب تک بیٹا "لختِ جگر" اور بیٹی "نورِ نظر"! غیرت یہاں اب تک سب سے بڑھ کر اماں کی اور بہن کی اور بیٹی کی، دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اور ان کی بے حرمتی کی طرف اشارہ، شریفوں کو چھوڑیئے، بازاریوں اور آوارہ مزاجوں کی زبان میں بھی سب سے بڑی گالی ہے۔ ادب یہاں اب تک بڑوں کا چلا آتا ہے۔ محلہ کا ہر آدمی "اگر سن میں بڑا ہے تو "اچھے" ہے۔ استاد اور گرو کا حق مانا جاتا ہے۔ اور اسٹرائکوں (ہڑتالیوں) کی جگہ الٹے ان لوگوں کے حق دو دو پشتوں تک مانے جاتے رہتے ہیں۔ خاندان کے معنی میاں بیوی کے جوڑے کے نہیں لئے جاتے ماں اور باپ کے علاوہ چچا اور ماموں اور پھوپھی اور خالہ اور بھاوج اور سالی، سالے اور بہنوئی اور وہ بھی صرف سگے نہیں رشتے کے۔ بیگانے نہیں اپنے اور خاندان سے خارج بھی، خاندان کا جزو سمجھے جاتے ہیں۔

یہاں بیسویں صدی میں بھی تعلقات آٹھویں صدی اور ساتویں صدی اور چھٹی صدی اور اس سے بہت پہلے کی صدیوں سے ٹوٹے نہیں، قائم ہیں، یہاں اب تک صبح اٹھ کر قرآن کی تلاوت ہوتی ہے اور وید کے اشلوک پڑھے جاتے ہیں۔ یہاں والوں کی سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا کہ مذہب کی بنیادی حقیقتیں اور اخلاق کی ٹھوس سچائیاں بھی ایک طرح لباس کے فیشن کے حکم میں داخل ہیں کہ صبح کو کچھ ہیں اور شام کو کچھ! ان کے دلوں پر اب تک حکومت گیتا کی اور رامائن کی، اور سعدیؒ کی اور مولانا رومؒ کی چلی آرہی ہے یہاں والے آج تک اپنے مذہبی پیشواؤں کی ہدایتوں کو سورج کی روشنی کی طرح مستقل اور پائیدار سال کے تین سو پینسٹھ دن قائم مانتے ہیں، اور بزرگوں کے نام پر محفلیں مجلسیں کرتے اور اپنی اپنی سمجھ کے لائق ان کی

یادگاریں مناتے چلے آتے ہیں۔

یہاں اب بھی انکسار، فروتنی اور عاجزی کو اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہاں شریف اُسے سمجھا جاتا ہے۔ جو زندگی کی دوڑ میں، دوسروں کو ڈھکیل کر گرا کر، اپنا راستہ صاف کرنے میں ہر جگہ، اپنے کو پیچھے رکھتا ہے، خود ہٹتا جاتا ہے اور دوسروں کو آگے بڑھاتا جاتا ہے اپنے کارناموں کو مشتہر کرنے اور اپنے کمالات کا "مینیفسٹو" شائع کرنے کے فن میں بھی ابھی وہ بالکل ہی ناآموز بالکل اناڑی اس کے یہاں اپنے لیے دستور اس قسم کے الفاظ کے استعمال کرنے کا ہے "حقیر پرتقصیر، کمترین، مسکین، خاکسار، ذرۂ بے مقدار، خادم، آثم اور جب کوئی اسے آگے بڑھانا چاہتا ہے تو جواب اس قسم کا سننے میں آتا ہے "یہ محض آپ کا کرم ہے، حسن ظن ہے، بندہ نوازی ہے، عزت افزائی ہے یہ خاکسار ہے کس قابل۔

یہاں کے باشندے اپنی سادہ بولی سے اب تک مہمان نوازی کو کوئی صفت سمجھے ہوئے ہیں۔ اور گھر کو ہوٹل بنا دینے اور مہمانوں کے آگے بل پیش کر دینے کے فن میں بالکل کورے ہیں۔ اُن کے وسیع چوپال، ان کے کشادہ چبوترے، ان کے فراخ صحن ہر وقت آنے جانے والوں کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ ڈرائنگ روم اور روز ویٹنگ کارڈ کی رسم اور ان کے باہمی تعلق کی خبر سے ان کے کان ناآشنا ہیں۔ ان کے کچے گھروں کی بڑی رونق ہے ان کی صفائی اور ستھرائی اور اصلی زینت ہے ان کی لپائی پتائی بیش قیمت کوچ اور صوفے اب تک ان کی نظروں میں کچھ زیادہ جچے نہیں ہیں۔ زمین کے قدرتی، سادہ فرش پر بڑا تکلف و اہتمام کیا تو گدے اور قالین اور سفید چاندنی کا اُجلا اُجلا فرش ان کے لیے کافی سے زائد ہے جاڑے اور کافی

کی چاٹ اب تک ان میں سے بہتوں کو نہیں پڑی ہے۔ گھروں میں پلی ہوئی گائیں اور بھینسیں اور یہ انھیں کے دودھ، دہی، مکھن اور گھی میں مگن، سگار اور سگرٹ کے فوائد اب تک ان کی سمجھ سے باہر ہیں۔ پان کی گلوریاں، الائچیاں بھی ان کے ہاں تکلفات!

ان کی تفریح کی جگہیں خود ان کے گھروں کے اندر۔ انگنائیاں اور دالان، پائیں باغ اور چمن۔ بیوی بچوں میں، گھر گھرانے کے دوسرے لڑکوں لڑکیوں میں دل ایسا بہلا رہتا ہے، کہ تھیٹر اور کارنیوال، سینما اور نائٹ کلب میں راتیں گذارنے کا دھیان بھی نہیں آتا۔ یہ صبح سویرے جب آنکھ کھولتے ہیں تو خدا کا نام لیتے ہوئے اور رات کو جب سونے لیٹتے ہیں تو اپنے تئیں خدا کو سونپتے ہوئے، یہاں کی چڑیاں تک جب چہچہاتی ہیں تو یہ بول اٹھتے ہیں کہ وہ دیکھو خدا کا نام جپ رہی ہیں کوئل کی کوک میں، مرغ کی بانگ میں، پپیہے کی پکار میں، قمری کے زمزمہ میں، بلبل کے نغمہ میں، مور کے شور میں، سب میں انھیں پروردگار کے نام کی تسبیح ہی سنائی دیتی ہے۔

ان کے ہاں کماتا ایک ہے تو کھاتے دس بیس ہیں، لڑکے بالے بھائی بہن، ماں باپ، خون کے رشتہ دار اور دودھ کے رشتہ دار اپنے عزیز اور پھر اُن عزیزوں کے عزیز، ایک کی کمائی میں خدا جانے کتنے شریک! خود غرضی کا یہ فلسفہ ابھی یہاں تک نہیں پہونچا ہے کہ محلہ کے بوڑھوں اور اپاہجوں پڑوس کے لنگڑے لولے اور اندھوں اور بستی کے یتیموں اور رانڈوں کا حق ہی کسی کمانے والے کی کمائی میں کیا ہے؟ باضابطہ "محتاج خانے" اسی لیے اس سرزمین میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ کوئی بیمار پڑتا ہے تو گھر والے اس سے وحشت اور دہشت کھا کر بھاگ گئے نہیں اور یہ نہیں ہوتا کہ گھر کی مالکہ گھر کے

مالک کو نرسوں کے حوالہ کر، خود شام کو ٹینس یا شام کی تفریح کے لیے تشریف لے جائیں۔ مریض کی خدمت اور تیمارداری پر گھر بھر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور اسے بیمار پر کوئی احسان نہیں، خود اپنے لیئے باعث سعادت سمجھا جاتا ہے اور اگر گھر والوں میں کوئی اس قابل نہ ہو تو محلہ والے ہجوم کرکے آ گھستے ہیں، اتنے رضاکاروں (والنیٹروں) کے ہوتے ہوئے باضابطہ ٹرینڈ نرسوں کی فوج کی فوج قدرتاً یہاں تیار نہیں ملتی۔

ان کے ہاں بچہ جب تعلیم کو بٹھایا جاتا ہے، تو سب سے پہلا سبق خدا کے نام ہی کا ملتا ہے یہاں تک کہ "بسم اللہ" کرانا ان کی بولی میں ہم معنی قرار پاگیا ہے ہر امر کی ابتدا کرنے کا، یہاں کی کانگریس، کانفرنسیں، لیگیں جب اپنے پرجوش جلسے کرتی ہیں تو دھواں دھار تقریریں اور گرما گرم بحثیں تو بعد کو ہوتی ہیں پہل ہوتی ہے کسی نہ کسی صورت میں خدا ہی کی حمد و ثنا سے۔ یہاں کے اہل قلم جب تصنیف کرنے بیٹھتے ہیں تو پہلی سطر ہوتی ہے حمد الٰہی کی، ان کے ہاں جو قصے، کہانیاں رائج ہیں، ان میں کوئی نہ کوئی تعلیم ضرور ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں کوئی نہ کوئی درس اخلاق کا معرفت الٰہی کا خواہ مخواہ ہوتا ہے "ادب ادب کی غرض سے" "فن فن کی خاطر" "آرٹ آرٹ ہی کے لیے"، اونچے بہت اونچے فلسفہ تک ان بیچاروں کے دماغ کی رسائی ابھی نہیں ہو پائی ہے۔

الکشن کے فن جدید میں بھی یہاں والے ابھی بہت پیچھے ہیں حریف کو نیچا دکھانے کے نئے داؤں گھات ابھی ان کی عقل کی گرفت میں نہیں آئے ہیں۔ اس لیے جب انھیں خود بحیثیت امیدوار اپنا فخریہ پیش کرنا ہوتا ہے تو کچھ جھجکے سے جاتے ہیں۔ اور جب بڑھتے ہیں تو ٹھوکر قدم قدم پر کھاتے ہیں۔ مروت ان کی گھٹی میں پڑی ہے یہ غریب کیا جانیں کہ وقت پر کام نکال لینے کا فن کیا ہوتا

ہے، ان کی مسجدیں ان کی خانقاہیں، یہاں تک کہ ان کے میلے ٹھیلے، لوگوں کو اکٹھا کرنیوالے اور مرکزِ وحدت کی طرف لانے والے ہوتے ہیں۔ اُنھیں کیا خبر کہ سیاسی بڑائی اس میں ہے کہ آپس میں خوب لڑا جائے ـــ اور پارٹی در پارٹی بنتی چلی جائے!

ان کے ہاں عورت کے لئے نظریں نیچی رکھنا اور جسم کو ڈھکے رکھنا ابتک شرافت کا نشان اور عصمت کی پہچان ہے۔ یہاں تک کہ ان میں جو بدنصیبیں بالکل بازاری ہوجاتی ہیں وہ بھی دنیا کا شرم ولحاظ رکھتی ہیں اور عام مجلسوں میں بیباک نہیں ہوتیں یہ دقیق علوم ان کی سمجھ میں اب تک نہیں آئے ہیں کہ اگر کالج کے ایک ہی کلاس میں نوجوان لڑکے اور نوجوان لڑکیاں زانو بہ زانو بیٹھ کر پڑھیں گی تو ان کا دماغ زیادہ روشن ہوجائے گا یا اُنکی عقل کی زیادہ جِلا ہوجائے گی یا عورتیں اگر اپنے جسم کا بڑا حصّہ قیدِ لباس سے آزاد کئے، بازاروں میں، اسٹیشنوں پر، سینما کے تماشہ گھروں میں پھریں گی تو اس سے ان کے اخلاق بلند ہوجائیں گے۔ ابھی تک یہاں کی عورتیں اپنا مقصدِ زندگی صرف خدمت سمجھ رہی ہیں۔ خدمت ماں باپ کی بہن بھائیوں کی شوہر کی اولاد کی اور خوش نصیب سمجھی جاتی ہیں وہ سہاگنیں جو خدمت کرتی ہوئی شوہر کے ہاتھوں اُٹھ جائیں۔ یہاں کے اخبارات عدالت طلاق کی کارروائیوں سے لبریز نہیں ہوتے۔ یہاں لڑکی جب بیاہ کے بعد اپنا گھر چھوڑ سسرال جاتی ہے تو ساس کی شکل میں اُسے دوسری ماں اور سسر کی صورت میں اُسے دوسرا باپ میسّر آجاتا ہے اور اس طرح اُن دونوں کو بہو کے قالب میں ایک اور بیٹی مل جاتی ہے۔ یہاں کے نظام خاندان کی بنیاد کشمکش (STRUGGLE)

پر نہیں یاری و مدد گاری (ALLIANCE) پر ہے۔

قناعت اور زہد و تقوے کا اب تک ان کے ہاں بڑا درجہ ہے خان بہادری اور رائے بہادری اور نائٹ ہڈ تو ان کے بس کی چیز نہیں۔ اسے تو چھوڑیئے۔ باقی یہاں کی زبانِ خلق مقدس انھیں کو ٹھہراتی ہے جو بڑے بڑے بنکوں کے ڈائرکٹر اور بڑی بڑی کمپنیوں کے شیر ہولڈر نہیں بلکہ جو دنیا سے منہ موڑے اور ہوس دنیوی کو چھوڑے ہوتے ہیں۔ عقیدت کے پھول انھیں آستانوں پر چڑھتے ہیں جو فقر اور مسکنت کے تاجدار ہوتے ہیں۔ اعتقاد دواؤں سے بڑھ کر دعاؤں پر رہتا ہے اور پھر بھروسہ تدبیر سے کہیں زیادہ تقدیر پر۔ بلاؤں کے وباؤں کے دور کرنے کے لیے یہ محض ڈاکٹروں کے حکیموں کے سہارے پر نہیں رہتے، راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں کرتے ہیں۔ روزوں کی منت مانتے ہیں، صدقہ دیتے ہیں، خیرات کرتے ہیں۔

یہ ہماری یعنی ہم مشرقیوں کی سوسائٹی کا دھندلا سا خاکہ اور پرانی دنیا والوں کی مجلسی زندگی کا مختصر سا نقشہ۔ لیکن قریب ہے کہ یہ حال ماضی ہو کر رہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی کا جو شعر شروع مضمون میں عرض ہوا تھا ایک بار حافظہ میں پھر تازہ کر لیا جائے ؎

ہوٹل سے بھلا پرہیز کہیں، اب پنڈت جی مہراج کہاں
سچ بات کہی جس نے یہ کہا جب لاگ لگی تب لاج کہاں

پنڈت جی مہراج، اپنی بات پر جمے رہتے، اپنی آن پر اڑے رہتے، مین کینسرویٹوازم کی تصویر تھے۔ جب وہی اپنی جگہ سے اتنا سرک

گئے تو ہمہ شما کا ذکر ہی کیا مشرق کو، انقلاب کے ہنگامے مغرب سے گڈ مڈ کر رہے ہیں اور پرانی دنیا کو نئی دنیا میں تبدیل ہونے کے لئے صدیوں کیا معنی، برسوں کی مدت درکار نہیں، مہینوں، بلکہ ہفتوں میں دنیا کہاں سے کہاں پہونچ رہی ہے۔

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردّی
بُدّھو! اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

اودھ اور مگدھ دلیش اجودھیا اور پاٹلی پُتر مدت ہوئی افسانہ بن چکے۔ بلگرام اور خیر آباد، بارہہ اور عظیم آباد کی دل و دماغ پر حکومتیں مدت ہوئی ختم ہوچکیں۔ لکھنؤ کی لکھنویت ایک ٹمٹماتا سا چراغ، دہلی کی دہلویت ایک شمع بلا فانوس، لندن، پیرس اور نیویارک کی ہواوں کے جھونکے ہر لحظہ بجھا دینے کو تیار اور اب سب سے بڑھ کر ماسکو کی آندھی کے جھکڑ!

بدل جائے گا انداز طبائع دور گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے ساماں بہم ہونگے

بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ ہیں جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے

گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائینگے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہونگے

تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

ریڈیو والوں کا یہ احسان کچھ کم ہے کہ جو تہذیب عنقریب مٹنے والی

اور جو زندگی دیکھتے دیکھتے ختم ہونے والی ہے اُس کی ایک ہلکی سی جھلک آئندہ زمانہ میں آثار قدیمہ کا کھوج لگانے والوں کے لیے محفوظ کرا دی۔

---

(۲) قرآن کیا ہے[1]

رات کا وقت ہے تارے آسمان پر چھٹکے ہوئے۔ دنیا اندھیرے کی چادر میں لپٹی ہوئی۔ خلقت خوابِ غفلت میں مدہوش ایک خدا کا بندہ ہے کہ اس وقت بھی ہوشیار۔ بصارت اور بصیرت دونوں بیدار۔ یک بیک آسمان کے ریڈیو سے مکہ کی سرزمین پر نشر شروع ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلی لہر جو کرہ زمین کی فضا میں براڈ کاسٹ ہوتی ہے اس کا عربی تلفظ ہے اقرأ۔ یعنی پڑھ۔ قرآن بھی اسی مادہ سے بنا ہے۔ اس کے معنے ہیں وہ چیز جو پڑھی جائے، وہ چیز جو پڑھنے کے لئے ہے ـــــ سنہ شمسی مسیحی سے حساب لگایئے تو یہ بات آج سے ۱۳۲۹ سال قبل ۶۱۱ء عیسوی کی ہے اور سنہ قمری اسلامی کو نگاہ میں رکھئے تو ۱۳۵۸ھ میں ۱۳ سال اور جوڑ کر ۱۳۷۱ کی مدت اسے گزرے ہوئے سمجھ لیجئے۔

قرآن آسمان سے لکھا لکھایا ایک دن میں اکبارگی نہیں اُتر آیا۔ کُل مدت کوئی ۲۲ - ۲۳ سال کی تھی۔ کبھی کوئی ایک آدھ آیت نازل

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۳۹ء کی شام کو۔ وقت ۱۵ منٹ۔

ہوتی تھی کبھی اکٹھی بہت سی آیتیں۔ کبھی نزول بہت جلد جلد ہوتا کبھی درمیان میں لمبے لمبے وقفے ہو جاتے۔ اس غیبی ریڈیو کے اناؤنسر کہنا چاہئے کہ مشہور و معزز فرشتہ جبرئیل امین تھے اور عرش الٰہی سے اٹھنے والی لہروں کو قبول کرنے والی پلیٹ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کے قلب مبارک کی لوح باصفا تھی۔۔

قرآن کا سب سے پہلا وصف جو قرآن کے شروع ہی میں بیان ہوا ہے یہ ہے کہ وہ ایک کتاب ہے۔ ایک ضبط تحریر میں آئی ہوئی وحی الٰہی ہے، محض زبانی یادداشتوں کا مجموعہ نہیں، اور اس کی کتابیت ایسی ہے کہ اس کے سارے اوصاف سے زیادہ نمایاں۔ یہاں تک کہ آج اس کے سامنے دنیا کی کسی اور کتاب کو "کتاب" کہنا ہی مشکل ہے۔ یہ خوش عقیدگی نہیں، اظہار واقعہ ہے۔ خیال کرکے دیکھئے۔ آج روئے زمین کے مختلف حصوں میں مسلمان ۴۰ کروڑ آباد ہیں۔ ان میں نمازی اگر سَو میں پانچ فرض کئے جائیں، جب بھی نمازیوں کی تعداد ۲ کروڑ نکلتی ہے اور جتنے نمازی ہیں سب قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہی یاد سے پڑھتے رہتے ہیں۔ نفلوں کو چھوڑیئے جو نمازیں فرض ہیں وہی پانچ مرتبہ روزانہ ہیں اور قرآن ہر رکعت میں پڑھا جاتا ہے اور سال کے ایک پورے مہینہ رمضان میں قرآن کا دور رات کی نمازوں میں جو ہوتا رہتا ہے وہ اس کے علاوہ ــــــ اور قرآن کے حافظوں کا یعنی اُن کا جنھیں قرآن اول سے آخر تک ازبر ہوتا ہے کوئی شمار ہی نہیں! مصر، شام، فلسطین، عراق وغیرہ میں یہود اور مسیحیوں کو جو سورتوں پر سورتیں یاد ہیں وہ الگ اور پھر دنیا کی مختلف

یونیورسیٹوں میں قرآن جو عربی ادب کے نصاب میں داخل ہے وہ ان سب پر مستزاد ـــــ حکم "اقراء" کی تعمیل اور کتاب کی "پڑھائی" کی ایسی مثال اس پردہ زمین پر اور کہاں ملے گی؟ جب ہی تو یہ شہادت ایک مسلم نہیں غیر مسلم فاضل کی زبان کی قرآن کے حق میں ادا ہوئی ہے کہ وہ "سب سے زیادہ پڑھی جانے والی موجود کتاب ہے"۔

(انسائکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۵ ص ۸۹۸ گیارھواں ایڈیشن)

THE MOST WIDELY READ IN EXISTENCE.

اسلام کا عقیدہ یہ نہیں کہ رسول اسلامؐ بندہ یا بشر ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی تھے وہ محض انسان تھے جیسے ہم سب ہوتے ہیں۔ البتہ اپنی صفائے قلب، پاکیزگی ضمیر، بلندی روح کے لحاظ سے ہم سب کے سرور و سردار تھے۔ قرآن آپ کے قلب پر نازل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ادھر کلام الٰہی فرشتہ کی زبان سے سُن کر آپ دُہراتے جاتے اور ادھر وہ کلام آپ کی لوح قلب پر نقش ہوتا جاتا اور اس کے بعد آپ اسے دوسروں کو پڑھ کر سُنا دیتے۔ عرب کا حافظہ ضرب المثل کی شہرت رکھتا ہے ان کی قومی تاریخ کا دارومدار ان کے حافظہ ہی پر تھا۔ بڑے بڑے طویل نسب نامے انھیں نوک زبان رہتے۔

ـــــ نسب نامے اپنے ہی نہیں، اپنے جانوروں تک کے! ـــــ شاعروں کے دیوان انھیں ازبر رہتے۔ یورپ خود عرب کی قوت حفظ پر حیرت کر رہا ہے اور پھر یہاں تو اس فطری قوت حفظ کے ساتھ دلی عقیدت و شیفتگی بھی جمع ہو گئی تھی، جو کچھ بھی سُنتے سب

نقطہ وشوشہ، زیر وزبر کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ صفحہ دل پر اس طرح اُتار لیتے کہ گویا پتھر پر لکیر بن گئی!

محفوظیت قرآن کے لئے خود یہی کیا کم تھا۔ اس کو کمک یوں پہونچی کہ قرآن عین اسی زمانہ سے نماز میں پڑھنا فرض ہوگیا۔ کوئی یہ سورت پڑھ رہا ہے کوئی وہ۔ فلاں فلاں آیتیں اِس نماز میں دُہرائی جارہی ہیں فلاں فلاں اُس نماز میں۔ یہ ہر وقت کا دور اور تکرار تو ایسی چیز ہے کہ کمزور حافظہ والوں کو بھی بات بھولنے نہیں دیتی، چہ جائیکہ جب یہ عمل عرب جیسی زبردست حافظہ والی قوم شروع کردے۔ رسولؐ کے ایک صحابی تھے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، قرآن کی کل ۱۱۴ سورتوں میں ۷۰ تو اکیلے انھیں کو یاد تھیں۔ لیکن اتنے پر بھی بس نہیں حفاظت قرآن کا سامان کافی کے حدود سے کہیں زائد۔ رسول کے ایک نہیں کئی ایک رفیقوں یعنی صحابیوں نے مختلف سورتوں کو لکھنا بھی شروع کردیا۔ حدیث میں ان صحابیوں کے نام تک دیئے ہوئے ہیں۔ کاغذ کا کام اس زمانہ میں عمدہ باریک چمڑے سے لیا جاتا تھا۔ کچھ قرآن اس پر لکھ لیا گیا۔ کچھ کھجور کے پتوں پر اُتار اگیا۔ کچھ لکڑی کی تختیوں پر نقش کرلیا گیا۔ غرض اس طرح متفرق طور پر کئی نقلیں قرآن کی رسول کے زمانہ مبارک ہی میں ہوگئیں تھیں۔ حضرت زید بن ثابتؓ ان سب لکھنے والوں کے سردار اور کہنا چاہیئے صاحبِ قرآن کے باضابطہ سکریٹری تھے۔ حدیث میں ان کا نام کاتب الوحی آتا ہے۔ یہ تفصیل اس غرض سے کی گئی کہ قرآن کی محفوظیت کا نقشہ نظر کے سامنے آجائے اور یہ اسی اہتمام کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان جہاں کہیں بھی آباد ہیں چاہے وہ برازیل ہو یا چین، فرانس

ہو یا ہالینڈ، بورنیو ہو یا جاپان جاوا ہو یا فن لینڈ۔ اور خواہ کسی فرقہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں سب کا قرآن بہرحال ایک ہی ہوگا۔ وہ بات بات پر آپس میں لڑیں گے اور اکثر بغیر کسی بات کے بھی۔ لیکن یہ نہ ہوگا کہ ایک فرقہ کا ایمان ایک قرآن پر ہو اور دوسروں کے ہاتھ میں کوئی دوسرا ہو۔ قرآن کے بے گنتی اور بے شمار نسخوں میں اختلاف، سورتوں کا اور آیتوں کا تو خیر بڑی چیز ہے۔ کوئی فرق اگر لفظوں کا اور حرفوں کا، نقطوں یا شوشوں کا بھی نکالنا چاہے تو یہ حسرت دل ہی میں لئے دنیا سے رخصت ہوجائے گا۔

اور پھر حافظوں کا وہ عجیب و غریب نظام جو دنیا کے عجائب میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ آج سے نہیں اول روز سے قرآن کا لفظ لفظ اور حرف حرف اس کثرت سے لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہے کہ اگر آج خدانخواستہ سارے ہاتھ کے لکھے ہوئے اور مطبع میں چھپے ہوئے قرآن دنیا سے ناپید ہوجائیں تو محض ان زندہ اور متحرک قرآنوں کی مدد سے سارا قرآن اول سے آخر تک بلادقت لکھا جاسکتا ہے۔ خود اس تقریر کے سننے والوں میں آج خدا جانے کتنے حافظ موجود ہوں گے۔ مجھ سے اگر قرآن کی کسی آیت کے پڑھنے میں غلطی ایک لفظ کی نہیں ایک حرف کی، ایک حرف کی بھی نہیں محض اس کے زیر زبر کی ہوجائے تو سیکڑوں آوازیں ٹوکنے والی اپنی اپنی جگہ پر اکبارگی بلند ہوجائیں۔ قرآن کا یہ وصف وہ ہے جس کا اقرار جتنا ماننے والوں کو ہے اسی قدر منکروں کو بھی — جرمنی کے نولڈیکی اور برطانیہ کے مارگیولیس معتقد و مومن نہیں نکتہ چین و حرف گیر ہیں اور قرآن کو

کلام الٰہی نہیں زور و شور سے کلام بشر قرار دینے والوں میں سے ہیں لیکن اتنا بہرحال کہے جاتے ہیں کہ یہ ہے وہی کلام جو ساڑھے تیرہ سو سال قبل مکہ اور مدینہ کی گلیوں میں اول اول صاحب قرآن کی زبان سے ادا ہوا تھا۔

قرآن پڑھائی کی سہولت کے خیال سے ۳۰ برابر حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر حصہ ایک پارہ کہلاتا ہے۔ لیکن اصلی تقسیم رسول اللہ صلعم کی فرمائی ہوئی پاروں میں نہیں سورتوں میں ہے۔ سورۃ وہی چیز ہے جسے ہم دوسری کتابوں میں باب کہتے ہیں۔ کُل سورتیں ۱۱۴ ہیں۔ آیت کو عام بول چال میں "جملہ" سمجھئے اور بائیبل کی اصطلاح میں "درس"۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو رسول خدا صلعم فرماتے کہ اس کو فلاں سورت میں لکھ لو، اب فلاں سورت ختم کرو۔ اس طرح سارا قرآن آپ اپنے سامنے مرتب فرما گئے۔ آپؐ کے بعد جب بہت سے حافظ جہاد میں شہید ہو گئے تو طے یہ پایا کہ سارا قرآن ایک جگہ مرتب کر کے لکھ لیا جائے۔ چنانچہ لکھ لیا گیا اس کے بعد تیسرے خلیفہ حضرت عثمان رضؓ نے اپنے زمانہ میں یہ کیا کہ اپنی نگرانی میں دوسرے ماہرین قرآن صحابیوں کی مدد و مشورہ سے ایک مکمل صحیح نسخہ قرآن کا نقل کر دیا اور پھر اس صحیح و مستند نسخہ کی نقلیں دوسرے مرکزی شہروں میں بھجوا دیں کہ اغلاطِ کتابت کا بھی ڈر نہ رہے۔ آج دنیا میں جتنے قرآن ہیں سارے کے سارے گویا اسی چراغ سے دوسرے چراغ برابر جلتے چلے آ رہے ہیں۔

آیاتِ قرآنی کی کل تعداد ۶۶۱۶ ہے اور الفاظِ قرآنی کی ۷۷۹۳۴ اور بعض نے ہمت کر کے حروفِ قرآنی کو بھی گن ڈالا ہے۔ اور ان کی میزان ۳۲۳۷۶۰ بتائی ہے۔ قرآن کی شرحیں جنھیں تفسیریں کہتے ہیں عربی

میں بڑی کثرت سے لکھی گئیں اور اب تک لکھی جارہی ہیں۔ ہر شارح نے قرآن کو اپنے فہم و مذاق کے مطابق سمجھنا اور سمجھانا چاہا ہے اور چونکہ ہر دور کے معلومات اور بصیرتیں دوسرے سے مختلف ہونا لازمی ہیں اس لئے تفسیروں کا باہمی اختلاف نہ تعجب خیز ہے نہ قابل اعتراض۔ ترجمے بھی متعدد زبانوں میں ہو چکے ہیں اور روز بروز ہوتے جاتے ہیں۔ فارسی کا پہلا ترجمہ شیخ سعدیؒ کی جانب منسوب ہے۔ جاپانی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور چینی زبان میں ایک نہیں متعدد موجود ہیں۔ ہندوستان میں ہندی، تلنگی اور تامل زبان میں ترجمے ہو چکے ہیں اور اردو میں ہر قسم کے ترجمے کم از کم ۲۰ - ۲۵ کی تعداد میں ضرور موجود ہیں۔ پرانے ترجموں میں شہرت و استناد کے سب سے بڑے حصہ دار شاہ عبدالقادر دہلویؒ اور شاہ رفیع الدین دہلویؒ ہیں۔ حال کے حضرات کی کاوشوں کا بہترین نمونہ مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا ترجمہ اور مولانا شبیر احمد صاحبؒ کا حاشیہ ہے۔

یورپ نے اسلام اور مسلمانوں کو سب سے قریب سے، پہلے پہل گو دشمن کی حیثیت سے سہی، بارھویں صدی عیسوی میں کروسیڈس (حروب صلیبی) کی تقریب سے دیکھا اور کہتے ہیں کہ لاطینی زبان میں پہلا ترجمہ رابرٹ آف ریٹینا کے قلم سے ۱۱۴۳ء میں ہوا۔ ۱۵۴۳ء میں بیلینڈر نے اس ترجمہ کو اٹالین زبان میں شائع کیا۔ پھر متعدد ترجمے فرنچ اور لیٹن میں ہوئے۔ ۱۶۴۸ء میں پہلا انگریزی ترجمہ فرنچ کے واسطہ سے الگزنڈر راس کے قلم سے ہوا۔ مراکی کے لیٹن ترجمہ نے ۱۶۹۸ء میں دھوم مچادی۔ جارج سیل[1] کا انگریزی ترجمہ

---

[1] SALE.

سنہ ۱۷۳۴ء میں نکلا اور اس نے انگریزی ترجموں کی راہ کھول دی لین[1] یا راڈول[2]، پامر[3]، اور سب سے آخر میں بل[4]۔ یہ سب مسیحی مترجمین تھے۔ نومسلم انگریز پکتھال[5] کے قلم سے ترجمہ نکلے ہوئے ابھی چند ہی سال ہوئے ہیں۔ اس جماعت کا تازہ ترین شاہکار عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ ہے۔ ڈچ اور جرمنی زبانوں میں ترجمے لاہور کی انجمن اشاعتِ اسلام کی طرف سے حال ہی میں ہوئے ہیں۔

قرآن محض کتاب العقائد نہیں۔ ایمانیات، عبادات، معاملات، فقہ، قانون سب کا جامع، زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے اور اس لحاظ سے سر ڈینی سن راس کا یہ لکھنا بالکل برحق ہے کہ قرآن کی حیثیت مسلمانوں کی نظر میں اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے جو بائیبل کی مسیحیوں کی نظر میں ہے۔ قرآن کی اعلیٰ اور مرکزی تعلیم توحید ہے۔ سیکڑوں کیا ہزاروں آیتوں میں اسی ایک مضمون کو دہرایا ہے ہر ہر ڈھنگ سے کہ خدا ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں نہ ذات میں نہ صفات میں، سب اس کے مخلوق، سب اس کے بندے، کوئی نہ اس کا مظہر نہ اس کا بیٹا۔ قدیم صرف اس کی ذات باقی سب حادث و فانی، روح و فرشتہ و پیمبر سب اس کے محتاج، وہ خود سب سے بے نیاز سب اسی کے اشارے پر نیست سے ہست ہوئے۔ وہی سب کو عدم محض سے وجود میں لایا بغیر روح مادہ یا کسی سہارے۔ وہی سب کا خالق وہی سب کا رازق، وہی جلاتا ہے وہی پالتا ہے وہی مارتا ہے۔ وہی قدرت والا، علم والا، حکمت والا ہے نہایت درجہ شفیق و حلیم کریم و رحیم۔ بندوں کو نیک و بد

---

[1] LANE. [2] RODWELL. [3] PALMER. [4] BILL.

[5] PICTHALL.

پوری طرح سمجھا کر دونوں راہیں ان کے سامنے کھلی چھوڑ دی ہیں۔ اب جو چاہے فہم و قوت ارادہ کے صحیح استعمال سے راہ راست اختیار کرے، جس کا نتیجہ راحت ہی راحت ہے اور جو بدبخت چاہے اپنی بدفہمی اور کجروی سے ٹیڑھے راستہ پر پڑے، جس کا انجام مصیبت ہی مصیبت ہے۔ خدا ظالموں کو ان کے عمل کی سزا بھگتائے گا اور یہی اس کا غضب و انتقام ہے۔ لیکن کوئی مجبوری یا بندی اُس پر اس باب میں نہیں۔ جس کو چاہے معاف بھی کر سکتا ہے۔

اس کی صفت عدل کے پورے ظہور کے لئے لازمی ہے کہ اس "آج" کا ایک کل بھی ہے۔ اس لئے اس سلسلہ کائنات کے خاتمہ پر قیامت قائم ہوگی۔ اس وقت ہر چیز غیب سے نکل کر مشاہدہ میں آجائے گی۔ آج جو پردہ پڑا ہوا ہے وہ سب کی آنکھوں سے ہٹ جائے گا اور یہ اپنی حقیقت اپنی شکل میں ہر ایک کو نظر آجائے گی۔ عمل و عقیدہ کے جو بیج آج پڑ چکے ہیں کل سب پورے درخت ہو کر نمایاں ہوں گے۔ اچھوں کیلئے جو اُخروی اور ابدی آرامگاہ ہے اس کا نام جنّت ہے جہاں کی نعمتوں کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔ بدوں کے لئے جو دائمی جیل خانہ ہے اس کا نام دوزخ یا جہنم ہے۔ جن بدنصیبوں نے اپنی روح میں جنّت کی نعمتوں کے قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رکھی ہے ان کے لئے اس قیدخانہ سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے گوبر کا کیڑا عطردان کے اندر زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔

خدا نے عقل و فہم سے بھی بڑھ کر ایک اور نعمت انسان کو دی ہے اس کا نام وحی ہے۔ اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے ہر ملک اور ہر زمانہ میں وہ اپنے کسی بندہ کو اپنا خاص پیام بھیجتا رہتا ہے اسے وحی کہتے ہیں اور ایسے بندہ کو پیمبر یا رسول۔ پیمبروں پر کتابیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ خدا اور خاک کے بنے

ہوئے رسول کے درمیان ایلچی کا کام ایک نوری مخلوق سے لیا جاتا ہے، جسے مَلَک یا فرشتہ کہتے ہیں۔ ساری حکومتِ الٰہی میں قانونِ الٰہی کا نفاذ بھی انھیں فرشتوں کے ذریعہ سے ہوتا رہتا ہے۔ بس اس کے سوا فرشتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ کارخانۂ قدرت میں بجائے خود کوئی دخل، تصرف اور اختیار انھیں مطلق حاصل نہیں کتابوں کے سلسلہ میں سب سے آخری کتاب کا نام قرآن ہے۔ زندگی کے اس مکمل و محفوظ دستور العمل کے بعد قطعاً کسی دوسرے ہدایت نامہ کی دنیا کو ضرورت نہیں۔ اور پیغمبروں کے سلسلہ کے خاتم محمد مصطفےٰ صلعم ہیں جن کا لایا ہوا قانونِ شریعت اتنا جامع و مفصل، اور تمام ضروریات و حالاتِ بشری کا اسی طرح کفیل ہے کہ اب گنجائش نہ کسی نبی جدید کی، نہ کسی نبوت مزید کی۔ آئندہ بھی جتنی ضرورتیں پیش آئیں گی سب کے حل اسی عالمگیر شریعت کے کلیات سے نکلتے رہیں گے۔

قرآن کے بتائے ہوئے اہم و بنیادی عقائد بس اسی قدر ہیں۔ اصلاحِ عقائد کے بعد قرآن کا سارا زور اصلاحِ عمل پر ہے۔ عبادات کے سلسلہ میں اس نے سب سے پہلے نماز کو پیش کیا ہے۔ صبح تڑکے قبل طلوع، اور بعد دوپہر، سہ پہر کو اور شام کو اور کچھ رات گئے۔ پانچ وقت ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے کہ چہرہ اور ہاتھ پیر کو ایک خاص طریقہ پر دھو کر جس کو وضو کرنا کہتے ہیں کعبہ کی طرف منھ کر کے ایک خاص طریقہ پر کھڑے ہو کر اور جھک کر اور زمین پر گر کر اپنے معبود کو یاد کرے۔ اور اس سے زائد بار بھی کر سکے تو بہتر ہے۔ مردوں پر لازم ہے کہ نماز مسجد میں جا کر حتی الامکان جماعت کے ساتھ ادا کریں۔ دن میں پانچ پانچ مرتبہ ایک خاص وقت پر ایک خاص سمت رُخ کر کے بڑے اور چھوٹے امیر و غریب، عالم و عامی سب کا ایک ساتھ ہاتھ باندھنا، ایک ساتھ جُھکنا

اور گرنا اور اٹھنا، ایک ساتھ عرض و معروض کرنا اپنے اندر جو ذخیرہ روحانی و مادی اسرار کا رکھتا ہے ان کی جانب اگر اشارہ بھی کئے جائیں تو یہ تقریر اپنی پاؤ گھنٹے کی بندھی ہوئی مدت سے کئی گنی بڑھ جائے۔

نماز کے بعد دوسرا فرض رمضان کے روزے ہیں۔ چاند کے سال میں جب نویں مہینہ کا چاند دکھائی دے، اس وقت سے ہر مسلمان مرد عورت پر فرض ہو جاتا ہے کہ ایک مہینہ کی مدت تک صبح تڑکے سے لیکر غروب آفتاب تک اپنے کو بھوک پیاس وغیرہ جائز جسمانی خواہشوں سے اپنے کو روکے اور ان لذتوں سے اپنے کو محروم کئے رکھے۔ سال کے بارھویں حصہ میں یہ مسلسل مجاہدہ یا انگریزی اصطلاح میں ڈسپلن اگر اپنے شرائط کے ساتھ پورا کر لیا جائے تو یہ ایک عجیب وغریب روح مادی و روحانی دونوں حیثیتوں سے امت اسلامی میں پھونک دیتا ہے۔ تیسرا رکن عبادات اسلامی کا زکات اور چوتھا حج ہے۔ قرآن میں نیک کاموں میں خرچ کی انتہائی ترغیب دی ہے لیکن اس کے علاوہ خوشحال لوگوں پر ان کے مال کا ۱/۴۰ حصہ کارِ خیر میں دیتے رہنا لازمی کر دیا ہے۔ اس کا نام زکوٰۃ ہے۔ سونا، چاندی، غلہ، جانوروں وغیرہ کیلئے الگ الگ شرحیں ہیں۔ اس خدائی ٹیکس کی دنیوی مصلحتوں اور حکمتوں کا حال آج کسی ماہر معاشیات سے پوچھ دیکھئے۔ حج نام ہے اس سالانہ اجتماع کا جو مرکز اسلام مکہ میں خانہ کعبہ کے ارد گرد اسلامی سال کے آخری مہینہ ذالحجہ کی ۸ تاریخ سے لیکر ۱۲، ۱۳ تک ہوتا رہتا ہے۔ اس میں شرکت، طواف، احرام وغیرہ کے خاص شرائط کے ساتھ دنیا کے ہر گوشہ کے صاحب قدرت مسلمان پر فرض ہے۔ یہ بین الاقوامی کانگریس، روحانی پہلو کو چھوڑیے ملی منافع کے اعتبار سے بھی بس اپنی نظیر آپ ہے۔ امریکہ کے ایک صاحب نظر مفکر ڈینٹسن نے سایکالوجی (نفسیات)

اور سوشیالوجی (اجتماعیات) پر ایک بلند پایہ تصنیف Emotion as the basis of Civilisation کے نام سے ابھی کچھ روز ہوئے شائع کی ہے۔ اس میں ضمناً وتفصیلاً ذکر ان چاروں ارکان کا آگیا ہے۔ مصنف نے چاروں کی داد دل کھول کر دی ہے اور یہ ایک نام تو صرف نمونہ کے طور پر دیا گیا ہے ورنہ آنکھیں تو بہتوں کی اسی طرح کھل چکی ہے۔

عبادات کا رخ براہِ راست خالق کی طرف ہوتا ہے۔ کردار انسانی میں جہاں سابقہ ایک مخلوق کا دوسری مخلوق سے رہتا ہے ان حصوں کا نام اخلاق اور معاملات ہے۔ اس میں انسان کا برتاؤ انسان کے ساتھ، بیوی کے ساتھ، ماں کیساتھ، حاکم کیساتھ، محکوم کیساتھ، ہم سفر کیساتھ خود اپنے نفس کے ساتھ، غرض سب ہی کے ساتھ آجاتا ہے۔ قرآن نے زندگی کے ان سارے شعبوں سے متعلق ایک ہمہ گیر ضابطہ عمل پیش کیا ہے۔ معاملات کو عبادات کے حکم میں داخل رکھا ہے اور اپنے پیروؤں کو ہرگز آزاد و بے قید نہیں چھوڑا ہے کہ جو چاہیں کھائیں پئیں جس طرح چاہیں رہیں اور جس سے جس طرح جی میں آئے ملیں جلیں۔

قرآن کے نقشہ زندگی میں شراب اور اسی طرح کے نشے قطعی منع، بعض گندے جانور، (مثلاً سور) حرام اور کوئی سا بھی جانور ہو جب تک خدا کا نام لے کر اسے ذبح نہ کیا جائے حلال نہیں۔ سود کا لین دین شرح ہلکی سی ہلکی سہی بہر صورت حرام۔ جوئے کی اجازت قطعاً نہیں۔ مرد و عورت کی آزادانہ خلا ملا کی ساری راہیں بند۔ بدنظری پر پہرہ بیٹھا ہوا۔ گندی نظمیں، گندے کھیل تماشے ناٹک سوانگ، گندی تصویریں الگ رہیں۔ قرآن ایسے تذکروں اور چرچوں کا بھی روادار نہیں۔ غیبت، جھوٹ، بہتان، دلآزاری، بدعہدی، تجارتی دھوکا اور دھڑی، سب کی روک تھام کے لئے سخت سے سخت سزائیں اور وعیدیں موجود

ایک سے زائد شادی کرنے اور طلاق دینے کے باب ہیں نہ اتنی تنگی کہ کسی حال میں اور کسی ضرورت سے بھی ان کی گنجائش ہی نہ نکلے اور نہ اتنی آزادی کہ جب جس کا جی چاہے بغیر کوئی ذمہ داری محسوس کئے کر گزرے۔ دین فطرت کے دستور العمل میں فطرت بشری کے مطابق ہر جگہ مناسب قیود، ہر قدم پر مصلحت و حکمت کے حدود۔ عورت کو نہ اتنا دبایا کہ بیوی کو باندی بنا کر چھوڑا نہ اتنا چڑھایا کہ شوہروں پر دھوکا زن مریدوں اور زن پرستوں کا ہونے لگے۔ ان کے حقوق اُن کے اوپر، اُن کی ذمہ داریاں اِن کے سر، ہر معاملے میں زور حق سے کہیں زیادہ فرض پر۔ خرچ میں نہ اسراف کی اجازت نہ بخل کی حمایت۔ ہر چیز نقطۂ اعتدال پر نہ افراط یا زیادتی کی لعنت نہ تفریط یا کمی کی شامت۔ کوئی چوری کرے تو اپنے ہاتھ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ نکاح کے دائرہ سے قدم باہر نکالے تو جیتا بھی نہ بچنے پائے۔ ماں باپ کی خدمت کی تاکید شدید عزیزوں و مسکینوں، پڑوسیوں، ہمسایوں سب کے حقوق ادا کرنے واجب۔ بلا ضرورت اور بغیر مقصد صحیح کسی مخلوق پر بھی ہاتھ اُٹھانا جائز نہیں۔ اور جب شریعت کے مطابق ضرورت آپڑے تو پھر خدا کی راہ میں بندہ بڑھ بڑھ کر اپنی جان دے اور دوسرے کی جان لے۔

قرآن کی حکومت اگر کسی خطہ زمین پر قائم ہوجائے تو آبکاری کا محکمہ شریف تو اسی دن تخفیف میں آجائے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں سے پینے پلانے کی دوکان بڑھ جائے۔ شرابیوں، افیونیوں، چانڈو بازوں کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔ تاڑی خانوں، سیندھی گھروں میں جھاڑو پھر جائے۔ قمار خانوں میں قفل پڑ جائیں۔ ناچ گھر اُجڑ جائے فحش و بےحیائی کے اونچے اونچے بالاخانوں پر خاک اُڑنے لگے۔ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کا بازار سرد ہوجائے۔ "ہالی وڈ" میں نوبت

فاقہ کشی کی آجائے۔ سینما اور تھیٹروں کے پردوں پر ہمیشہ کے لئے پردہ پڑ جائے۔ عدالتوں کی رونق اور وکالت کی جان دروغ حلفی جاتی رہے۔ سودی بنکوں اور مہاجنی کوٹھیوں میں کتنے لوٹنے لگیں۔ لاٹریاں پڑنا، دیوالے نکلنا جائداد و ذوات کا نیلام قصہ کہانی بن جائے۔ مجرموں کی، مجنونوں کی، خودکشی کرنے والوں کی تعداد گھٹتے گھٹتے صفر تک آجائے۔ چوروں، رہزنوں، قاتلوں پر دُنیا تنگ ہو جائے، ڈپلومیسی کے لقب سے عزت پانے والی مکاریاں اور آرٹ اور فائن آرٹ کے پردہ میں چمکنے والی بےحیائیاں سب اس جہان کو داغِ مفارقت دے جائیں۔

---

(۳) عیدالفطر[1]

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد! آپ نے سنا، یہ ہر محلہ سے اور ہر گوشہ سے، ہر سڑک سے اور ہر چوراہے سے تکبیر کی آوازیں کیسی چلی آرہی ہیں؟ گویا خدائے واحد کا کلمہ پڑھنے لگے ریت کے ذرّے اور خاک کے بگولے اور اپنے رب کا نام جپنے لگے مکانوں کے درودیوار اور درختوں کے برگ وبار! آپ نے دیکھا، یہ بستی کی ہر ہر سمت سے کیسے اُمڈے چلے آرہے ہیں رئیسانِ نامدار بھی، اور ان کے ادنیٰ خدمتگار بھی، عالم وفاضل دیندار بھی، اور جاہل مطلق گنوار بھی۔ جھکے جھکے آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے والے بوڑھے بھی، اور دوڑتے اُچھلتے، کودتے چلنے والے بچّے بھی۔ زردار بھی، نادار بھی، پیدل بھی، سوار بھی۔ کوئی سائیکل پر کوئی موٹر پر، کوئی اِکّہ پر کوئی تانگے پر۔ ان میں وہ بھی ہیں، جنھوں نے رمضان کے دن بھوکے پیاسے رہ رہ کر، رمضان کی راتیں، رکوع وسجود، تسبیح وتلاوت میں رو رو کر گزاری ہیں اور وہ بھی جو سال میں ایک بار بھی سجدے میں نہیں

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۱۲ر نومبر دیکم شوال ۱۳۵۸ ہجری) کی شام کو۔ وقت: ۱۵ منٹ۔

گرے، ایک بار بھی کعبہ کی طرف نہیں جھکے! آج سب کے سب رواں ہیں دواں ہیں عید گاہ کی طرف ہنستے ہوئے چہروں کے ساتھ، اچھے اچھے کپڑوں کے ساتھ ـــــ یہ عملی تفسیر ہو رہی ہے اُس حدیثِ نبوی کی، جس میں آیا ہے کہ عید کی فجر سے اللہ کا فرشتہ پکارتا رہتا ہے لوگوں کو عید گاہ کی طرف! یہ عید گاہ کا جماؤ اور جمگھٹا، یہ راستہ بھر نمازیوں کی ریل پیل، یہ سال سال بھر کے بے نمازیوں کا یک بیک نمازی بن جانا، یہ بڑے بڑے پرانے بے غسلوں کا کڑکڑاتے جاڑوں میں صبح سویرے غسل پر آمادہ ہو جانا، یہ نازک خراموں کا گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں اتنی دور آنا اور جانا، اگر غیبی پکارنے والے کی پکار کا اثر نہیں تو اور کیا ہے؟ تفسیر زبان سے نہیں عمل سے، قال سے نہیں حال سے!

گرچہ تفسیر بیاں روشن گرست
لیکن عشق بے زبان روشن ترست!

عید آتی اپنے وقت پر ہے، لیکن آمد آمد کہنا چاہیئے کہ ایک مہینہ قبل سے شروع ہو جاتی ہے اور روزہ داروں کو جو بےشمار فرحتیں اس دنیا میں نصیب رہتی ہیں، اُن میں سے ایک خاص فرحت یہ عید کا انتظار بھی ہے۔ اِدھر رمضان آئے، اُدھر عید کی تیاریاں شروع ہو گئیں، کہیں چھپ کر، کہیں کھل کر۔ عید گاہ کی صفائی کا، سفیدی کا اہتمام ہونے لگا۔ راستہ ٹھیک کیا جانے لگا۔ دوکانوں پر عید کے لئے نیا مال آنے لگا۔ میدہ کی باریک باریک سوئیاں دیکھیے تو نازک اور اُٹھائیے تو سبک، بننے اور بکنے لگیں۔ رمضان ختم ہونے کے قریب آئے اور اُدھر چاند کا انتظار و اشتیاق دلوں سے زبانوں پر جگہ پانے لگا۔ جہاں دیکھیے یہی چرچا۔ جنتریاں دیکھی جا رہی ہیں۔ اندازوں کے تیر

چل رہے ہیں کہ چاند ۲۹ کا ہوگا یا ۳۰ کا۔ اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم، کچہریوں دفتروں کے اہلکار، عہدہ دار، چھٹی کا حساب لگا رہے ہیں، روزہ خور غریب کو ان لذتوں کی کیا قدر! لیجئے۔ ماہ مبارک کی انتیسویں آگئی ــــ نہ پوچھئے کہ آج چاند دیکھنے کے کیسے کیسے انتظام ہو رہے ہیں۔ بچوں، بوڑھوں، بہتوں کے دل میں یہی ارمان کہ چاند آج ہی ہو جائے۔ کچھ اللہ والوں اور اللہ والیوں کی زبانوں پر یہ دعا بھی کہ چاند آج کی جگہ کل ہو، روزے تیسوں پورے ہو جائیں۔ شام کے انتظار میں گھڑیاں صبح ہی سے گنی جا رہی ہیں۔

اسلامی ریاستوں اور شہروں میں تو دور دور سے چاند کی خبر منگانے کے باضابطہ سرکاری انتظامات رہتے ہیں۔ جوں ہی شام ہوئی اور بیشمار نظریں آسمان پر جم گئیں ــــ گویا آسمان پر کوئی قصیدہ لکھا ہے جس کے مطلع کی تلاش ہے ــــ اور جو کہیں عین وقت پر ابر آگیا، تو نہ پوچھئے دلوں پر کیسی جھنجلاہٹ چھا کر رہی! خدا خدا کر کے چاند نظر آیا، گولے پٹاخے چھوٹنے لگے۔ لیکن اس سے بھی پہلے جس نے چاند دیکھا، اُس نے دعا پڑھی۔ اللہ اکبر! چاند بہت بڑا، بہت روشن، بہت چمکدار سہی، لیکن بڑائی اس میں کیا رکھی ہے۔ بڑا تو وہ ہے جس نے اس کو پیدا کیا۔ اللھم اھلہٗ بالیمن والایمان۔ اے ہمارے اچھے پروردگار چاند دکھا ہم کو ساتھ خیر و برکت اور ساتھ سلامتی اور ایمان کے۔ والسلامۃ والاسلام۔ اور ساتھ خیریت اور عافیت اور اسلام کے۔ والتوفیق لما تحب وترضیٰ، اور ساتھ توفیق اس چیز کے جو تیری پسند و مرضی کے مطابق ہو۔ ربنا و ربک اللہ۔ گواہ رہ اے چاند کہ اللہ ہی پروردگار ہے ہمارا بھی اور تیرا بھی ــــ یہ اسلام کی مملکت ہے یہاں تو بات بات پر دعا، اور قدم قدم پر اپنے مالک و مولیٰ

سے التجا!

چاند دیکھا، چھوٹوں نے بڑوں کو سلام کیا اور ان کی زبانوں سے دعائیں لیں۔ شریف گھرانوں میں اب تک اسلامی معاشرت کی یہ جھلک پائی جاتی ہے۔ دوست احباب ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے۔ روزانہ افطار کے بعد تراویح کی فکر رہتی تھی۔ آج اُدھر سے اطمینان ہے۔ بچے خوشی سے اُچھل کود رہے ہیں۔ گھر کے بڑے بوڑھے صبح کی ضرورتوں کی فکر میں لگ گئے۔ دودھ اتنا آئے گا۔ سویّاں اتنی پکیں گی۔ فرش فروش رات ہی سے ہونے لگا۔ درزی اور موچی کی دوکان پر رات رات بھر بھیڑ لگی ہوئی۔ "جوڑا" اور پھر نیا، ہئی ہے آرزو اور ارمان کی چیز۔ گھر کے اندر راتی رات، لپ جھپ روشنی کے آگے کپڑوں کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اِدھر دوپٹہ پر لچکا ٹنک رہا ہے، اُدھر پائجامہ پر گوٹ لگ رہی ہے۔ ٹک ٹک جھک جھک کا ایک ہنگامہ برپا۔ لیکن اس ہنگامہ میں تلخی نہیں، خوشگواری۔

وقت کے قدر شناس آج کی شب کو بھی خالی نہیں جانے دیتے۔ رمضان کی ایک ایک رات دولتوں سے مالامال تھی۔ حدیث میں آتا ہے کہ وہی نعمتیں شب عید تک پھیلا دی جاتی ہیں۔ اللہ اللہ! جب بندہ نواز، یوں لٹانے پر آئے تو بندہ مانگنے میں کیوں کوئی کسر اٹھا رکھے۔ آج کی رات، رات ہے دعاؤں کی، مناجاتوں کی، روحانیت کی، ربانیت کی۔ اِدھر سے عبودیت کی، اُدھر سے ربوبیت کی۔ فضائے کائنات میں ہر ہر میٹر پر، ہر ہر WAVE LENTH پر بارش ہوئی رات رات بھر لطف و نوازش کی، عطا و بخشش کی۔

صبح ہوئی، اور صبح ابھی ہونے کہاں پائی، کہ بچے کھڑ کھڑ سے اُٹھ بیٹھے۔

رات بھر مارے خوشی کے نیند ہی کس کو پڑی؟

ہر گھر میں نہانے نہلانے کا کاروبار پھیل گیا۔ کسی کے یہاں حمام گرم ہے اور کوئی گھر کی انگنائی سے غسل خانے کا کام لے رہا ہے کوئی نہار ہا ہے مکان کی چھت پر، اور کوئی کوئیں کی جگت پر۔ آج مسلمان کے ہاں خوشی کا دن ہے، اور اس کو وہ اپنی بول میں عید کہتا ہے۔ عید اس کے ہاں سال میں دو بار آتی ہے۔ آج کی عید کا نام عید الفطر ہے۔ افطار اور افطاری کے محبوب نام اس 'فطر' سے نکلتے ہیں۔ مسلمان کا دن ہر روز فجر کے وضو سے شروع ہوتا تھا، آج غسل سے شروع ہوگا۔ وضو اور غسل دونوں کے لئے مستقل دعائیں ہیں کہ جسم کی صفائی کے ساتھ ساتھ روح بھی دھلتی اور نکھرتی چلی جائے۔ سبحان اللہ وبحمدہ، کیسا جامع پروگرام ہے، اور کیسا مکمل انتظام! جسم کا سنگھار بھی، اور روح کا نکھار بھی، اِدھر تفریح اُدھر تسبیح، اِدھر جسم کی جِلا اُدھر روح کی ضیا!

آج کے دن قبل نماز عید، ہر صاحبِ حیثیت مسلمان پر صدقہ ایک خفیف مقدار میں واجب ہے۔ اس کا نام صدقۂ فطر ہے۔ اہمیت اس حدیث نبوی سے ظاہر ہے کہ جب تک یہ صدقہ ادا نہ ہولے گا، رمضان کے روزوں تک کا اجر معلق رہے گا۔ آج مسلمان کے قومی و ملی جشن کا دن ہے، کم از کم آج تو مفلس سا مفلس بھی اسلام کی عملداری میں بھوکا نہ رہنے پائے۔ صدقہ تو نام ہے اس مالی اعانت کا، جو اسلام کے ملی نظام معاشیات میں ہر زردار نادار کی، ہر پیسہ والا بے روزگار کی کرتا رہتا ہے اور جس کے بعد بیروزگاری بے معاشی UNEMPLOYMENT کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہونے پاتا۔

غرض نہا دھو کر کپڑے بدل بدلا، عطر و خوشبو لگا، صدقہ دے دلا، شیر خرما اور سوئیاں پی پلا۔ مسلمان نماز کے لئے چلا۔ نماز عیدگاہ میں ہوگی۔ عیدگاہ، بستی سے باہر میدان میں ہوتی ہے۔ نہ پٹی ہوئی چھت، نہ دالان و شہ نشین۔ محلہ کے لوگ محلہ کی مسجد میں تو روز ہی پانچ پانچ مرتبہ جمع ہوتے ملتے جلتے رہتے ہیں، اور ہفتہ میں ایک بار بستی کے مسلمان جمعہ کی دوپہر کو۔ سال میں دو بار دونوں عیدوں کے موقع پر، شہر اور آس پاس کے مسلمان ایک جگہ اکٹھا ہوتے ہیں اور یہ مجمع گویا ہر مرکز کے ایمانی بھائیوں کی ایک کانفرنس ہوتا ہے۔ شریعت کی تاکید ہے کہ وحدتِ امت کے پروگرام کی یہ اہم کڑی کمزور نہ ہونے پائے۔

سورج ابھی پوری طرح بلند بھی نہیں ہونے پایا، کہ مسلمان اس نئی نماز کے لئے نکل کھڑا ہوا، گاتا بجاتا ہوا نہیں، رنگ کھیلتا ہوا نہیں، نشہ سے جھومتا جھامتا نہیں۔ آج اس پر HOLIDAY MOOD طاری ہے، خوشی کی مستی سوار ہے، صدائیں لگاتا، نعرے بلند کرتا، چل رہا ہے آپ سُنیں گے یہ نعرے کیا ہیں؟ اللہ اکبر اللہ اکبر! بڑائی ہم میں کہاں، ہماری کسی چیز میں کہاں؟ ہم آپ کے حضور میں، ہیچ محض صفر مطلق بڑائی تو صرف آپ میں ہے!۔ لا الٰہ الا اللہ! معبود آپ کے سوا اور ہے کون؟ زندگی کا اصل مقصود آپ کے سوا اور ہے کون۔ واللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد۔ بڑائی میرے مولا و آقا صرف آپ میں، بڑائی صرف آپ میں، حسن و جمال صرف آپ کی ذات میں، عزت و کمال صرف آپ کی صفات میں۔ ہماری ہر جنبش لب آپ ہی کی مدح و ستائش کا ایک عنوان، ہمارا ہر تارِ نفس آپ ہی کی قدرت و عظمت کی ایک داستان!

نمازیں روز پانچ وقت ہوتی تھیں، آج چھ وقت کی ہوگئیں! یہ ہے مسلمان کے خوشی منانے کا انداز۔ سب سے انوکھا۔ سب سے نرالا۔ مہینہ بھر کی قید اور پابندیوں کے بعد کہیں آج تو جا کر چھٹی ملی اور اس کا انعام یہ کہ نماز گھٹنے کے بجائے آج ایک اور بڑھ ہی گئی! مسلمان آج جیب میں پیسے ڈال کر اس لئے باہر نہیں نکلے گا کہ جوئے میں لگائے۔ شراب میں اڑائے، راگ رنگ میں گنوائے۔ بلکہ قدم اُٹھائے گا عبادت کے لئے! جسم کی صفائی و پاکیزگی کے ساتھ روح کی صفائی و پاکیزگی کے لئے! بستی کے باہر بستی کے کلمہ گوؤں کے ساتھ رکوع وسجود کی دولت حاصل کرنے کے لئے! یہ ہے اس کی خوشی، اس لئے کہ اسی میں اُس کے مولیٰ کی خوشی!

عیدگاہ پہونچے۔ یہاں کے جماؤ کا کیا کہنا۔ کوئی معمولی قصبہ ہے تو مجمع سیکڑوں کا، شہر ہے تو ہزاروں کا، بڑا شہر ہے تو ہزارہا ہزار کا، اور کلکتہ و بمبئی ہے تو نوبت لاکھ دو لاکھ کی! امیر بھی فقیر بھی، بڑے بھی چھوٹے بھی، شہری بھی دیہاتی بھی، بوڑھے بھی جوان بھی، چہروں سے ایمان کی مسرت ٹپکتی ہوئی۔ بشروں سے ادائے فرض کی بشاشت جھلکتی ہوئی۔ کوئی وضو کر رہا ہے، کوئی راہ کے گرد وغبار سے ہاتھ منھ دھو رہا ہے۔ کچھ لوگ آپس میں ہنس بول رہے ہیں، کچھ مصلوں پر قابض ہو کر ذکر و درود کی تسبیح میں لگ گئے ہیں اور کوئی صاحب ہیں کہ جوتوں کی فکر و انتظام میں لگے ہوئے ہیں —— صحن عیدگاہ سے باہر کا منظر بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ سودے والوں کا ہجوم، خوش خلاف گاہکوں اور تماشائیوں کی دھوم! خوانچہ والوں کی بہار، پھیری والوں کی چیخ پکار۔ ادھر سرخ سرخ کباب سیخ پر لگ رہے ہیں، اُدھر پکوان کے گھان کڑھائی سے

اُتر رہے ہیں۔ حقہ، پان، سگرٹ کی چاٹ، حلوائیوں کی دو کانوں کے ٹھاٹھ۔ کہیں چائے والے اپنے دم سے محفل گرمائے ہوئے، کہیں برف کی قفلی والے اپنا رنگ جمائے ہوئے! اور سب سے بڑھ کر بچوں کے کھلونوں، غباروں، جھنجھنوں والوں کا شور و غل، چیخ و پکار، بچوں کے ساتھ خود بھی بچہ بنے ہوئے۔

لیجئے نماز کا وقت آگیا، اور امام صاحب اپنے مصلے پر آگئے اور صفیں کھڑی ہونے لگیں۔ آج نہ اذاں نہ اقامت۔ مقصد ان دونوں کا اطلاع ہوتا ہے۔ مسجد کے باہر والوں اور اندر والوں کو آج یہ مقصد خود بخود حاصل، اس لئے اطلاع بے محل۔ نماز جماعت کا اہم پہلو عسکری بھی ہے اور صف بندی کی اہمیت آج جس لشکری سے چاہئے پوچھ دیکھئے۔ کوئی صاحب کھڑے ہو کر لگے پکار پکار کر ترکیب نماز کی تلقین کرنے۔ نماز عید کوئی پیچیدہ یاد شوار نہیں۔ کُل دو رکعتیں۔ نیت وہی جو سب نمازوں کی ہوتی ہے فرق صرف اتنا اور اتنے کے لئے ہر دفعہ تازہ تلقین کی ضرورت پڑتی ہے کہ خدائے پاک کی بڑائی آج اور زیادہ تاکید و تکرار کے ساتھ دُہرائی جاتی ہے چنانچہ معمولی تکبیروں کے علاوہ آج چند تکبیریں زائد کہی جائیں گی، ان کی تعداد حنفیوں کے ہاں چھ ہے۔ تین، رکعت اول میں نیت نماز کے بعد اور قرأت فاتحہ سے قبل کہی جاتی ہیں اور باقی تین، دوسری رکعت میں رکوع سے قبل اور قرأت فاتحہ کے بعد۔

عیدگاہ نہ کوئی سر بفلک عمارت، نہ یہاں کوئی جگمگاتا ہوا ہال، نہ کوئی عظیم الشان دالان۔ سرے سے چھت تک نہیں۔ پوری چار دیواری بھی نہیں۔ صرف ایک لمبی دیوار مغرب کی سمت کھنچی ہوئی آگے چبوترہ۔ بس یہ کل آئی کائنات! سادگی کی انتہا، دین فطرت کی سادگی کا ایک نمونہ! اور اس پر اس کی وہ دلکشی اور دلآویزی، کشش محبوبی! کسی دوسرے مجمع کو مقابلہ میں لایا، اور کسی

دوسرے منظر کو مثال میں بتلایا جائے؟ - حد یہ ہے کہ شاعر کی دنیا میں عیدگاہ دوسرا نام ہے کوئے یار کا دیار محبوب کا!

عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو!

اپنوں نے جو کچھ دیکھا اُسے چھوڑیئے' غیروں نے جو کچھ ان نمازکے نظاروں میں پایا' اس کی جھلک سر ٹامس آرنلڈ' اور بشپ لی فرائے وغیرہ کے الفاظ میں دیکھے ــــــ اس متن کی شرح و تفصیل کی تاب' شام عید کی یہ چلتی ہوئی ملاقات کہاں سے لا سکتی ہے؟

نماز ختم ہوئی اور دو رکعتوں کے بعد امام نے سلام پھیرا اور منبر پہ جا' خطبہ شروع کر دیا خطبے وہی دو ہوتے ہیں جمعہ کی طرح - دونوں خطبوں میں ہوتا کیا ہے؟ نہ پھڑکتی ہوئی غزلیں' نہ رنگین افسانے نہ ادب لطیف کے نمونے' نہ پرجوش ترانے - وہی رب کی نعمتوں کا شکر اور اس کی توحید کا اقرار - ترغیب توبہ اور تلقین استغفار - اِس سے وعدہ اُس کے لئے وعید' ایک کو بشارت' دوسرے کو تہدید - کہیں جنت کے پھولوں کی مہک' کہیں جہنم کے شعلوں کی لپک - نیکوں کو دلاسے اور خوشخبریاں اور بدوں کو ڈراوے اور دھمکیاں - کچھ فقہ و شریعت کے مسائل' کچھ رمضان و عید کے فضائل' غرض وہ سب کچھ جس کے ذکر و فکر سے شان دار اور نامور روزناموں کے صفحات خالی رہتے ہیں' اور آرٹ اور سائنس کے باتصویر میگزینوں کے اوراق کورے - دوسرا خطبہ ختم ہوا تو امام نے ہاتھ اٹھائے دعا کے لئے - اور کئی منٹ تک دعائیں مانگیں اللہ کے فضل و کرم کی اس دنیا میں بھی اور اس دنیا میں بھی - آج کے لئے بھی اور کل کے لئے بھی - انبیاء' اولیاء اور صالحین کے لئے بھی اور عام مومنین و مسلمین کیلئے بھی دعا ختم ہوئی لوگ

اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آپس میں ملنا ملانا شروع ہوگیا۔ اودھ کے علاقوں میں معانقہ یا گلے ملنے کی رسم شدت کے ساتھ جاری ہے۔

نماز پڑھی، خطبہ سُنا، دعا مانگی۔ یہ سب ملاکر دیر اچھی خاصی لگتی ہے۔ اس ساری مدت بھر خاصی کڑی دھوپ میں سارے نمازی بیٹھے رہتے ہیں۔ کہیں کہیں شامیانہ کے نیچے اور اکثر مقامات پر نہ تو شامیانہ نصب نہ کسی درخت کا سایہ۔ اور پھر بیٹھے کاہے پر ہیں، کوچ نہیں نہ صوفے، مخملی قالین ہیں نہ ریشمی گدّے کہیں دری کہیں چٹائی اور کہیں کھرا فرش زمین! نہ اُکتا اُکتا کر گھڑی دیکھیں گے، نہ گھبرا کر شور مچائیں گے۔ پسینے میں شرابور ہیں۔ لیکن اُٹھنے اور ہلنے کا نام نہ لیں گے، جب تک امام خود، دعا کے بعد منہ پر ہاتھ نہ پھیر لیں۔ امام کے اُٹھنے پر مجمع منتشر ہوا اور آپس میں ملتے ملاتے ہوئے لوگوں نے اپنے اپنے گھر کا راستہ لیا۔ واپسی پھر اسی طریقہ سے ہو رہی ہے۔ توحید کا کلمہ پڑھتے ہوئے، اللہ کی بڑائی جپتے ہوئے۔ واپسی بہتر ہے کہ دوسرے راستہ سے ہو کہ دیکھنے والوں پر شوکت اسلام کا اثر زیادہ پڑے۔

گھر پہونچے اور عزیزوں دوستوں کے جلسے جمنے لگے۔ آپس میں ملنا ملانا، کھلانا پلانا۔ ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا۔ شام اسی میں ہوگئی اور اب ان ہمیشہ کے معمولات پر اضافہ کیا بیسویں صدی کی ایجاد ریڈیو اور اس کے ذہین کارکنوں نے ایک گمنام و گوشہ نشین کی خدمتوں میں عید کی شام کو یہ عید کا سلام۔

---

(۴) ایک مکالمہ[1]

موجودہ سائنس رحمت ہے یا زحمت؟

میر صاحب۔ آداب بجا لاتا ہوں سرکار، مزاج شریف۔

شیخ صاحب۔ اخاہ، جناب میر صاحب قبلہ ہیں۔ تسلیم۔ تشریف لایئے
یہ آج چاند کدھر سے نکل آیا۔ اچھا اب میں سمجھا۔ مرزا صاحب ساتھ
ہیں یہی گھسیٹ لائے ہوں گے۔

مرزا صاحب۔ جی اور کیا یہ بھلا اب ریڈیو چھوڑ کسی سے ملتے ملاتے ہیں۔
وہ تو کہئے میں گرفتار کر لایا۔ آپ کو ان کے شوق کا حال معلوم ہے نہ
شیخ صاحب؟

میر صاحب۔ خیر یہ تو مرزا کی شاعری ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب سے
ریڈیو لے لیا ہے، باہر نکلنا ذرا کم ہو گیا ہے۔ ظالم میں کچھ ایسی لذت ہے
کہ چھوڑنے کو جی ہی نہیں چاہتا اور بھئی چیز بھی تو ایسی ہی ہے۔ چوبیوں
گھنٹے کا مصاحب۔ دن بھر چاہے باتیں سُنا کیجئے۔ دِل بہلایا کیجئے۔ نہ

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۱۳ر دسمبر ۳۹ء کی شام کو۔ وقت: ۱۵ منٹ۔
مکالمہ میں میر صاحب اور مرزا صاحب ریڈیو اسٹاف میں سے دو کارکن بنے ہوئے تھے۔

لڑائی جھگڑے کا ڈر، نہ کسی کی حکایت شکایت۔ میں کہتا ہوں شیخ صاحب ان ولایت والوں کو سوجھتی بھی کیا کیا ہے۔ کیسی کیسی چیزیں ایجاد کر دی ہیں واللہ ان کا سائنس ہے کہ جادو۔ کوئی حد ہے ان کی عقل کی رسائی کی۔

شیخ صاحب۔ جادو آپ کی عقل پر تو ضرور چل گیا ہے۔ مرد آدمی عقل نام ہے قوت فکری کا۔ ان مشینی ایجادوں سے قوت فکری کی کون سی کرامت ثابت ہو گئی؟ بس وہی جیسے ہمارے ہاں بڑھئی، لوہار، مستری کاریگر ہوتے ہیں، ویسے ہی ان کے ہاں، انجنیر، میکینک، الکٹریشین انجنیر۔ تجربہ ان کا بڑھا ہوا بہت بڑھا ہوا سہی۔

میر صاحب۔ حد کر دی آپ نے بھی شیخ صاحب۔ یہ کوئی کمال ہی آپ کے نزدیک نہ ہوا کہ آدمی گھر بیٹھے سیکڑوں ہزاروں میل کی خبریں دم بھر میں سن لے۔ لندن کا آدمی گویا دیوار کے پیچھے کھڑا ہو اور اب تو بولنے والے کی تصویر بھی آجایا کرے گی اور پھر خرچ ہی کیا۔ دو چار سو میں اچھا سا سٹ لے لیجئے۔ دیہات میں بیڑی لگا کر سنئے۔ سفر میں ساتھ رکھئے۔

شیخ صاحب۔ جی ہاں، اور یہ کمال کچھ کم ہے کہ گھر بیٹھے جن بائی صاحبہ کا چاہیے پتہ لگا لیجئے۔ نہ بدنامی کا ڈر نہ گلیوں میں خاک چھاننے کی ضرورت۔

میر صاحب۔ لاحول ولاقوۃ۔ آپ کی نظر بھی سب چھوڑ چھاڑ کہاں جا کر پڑی! میں کہتا ہوں کہ اول تو موسیقی کی سرپرستی میں عیب ہی کیا ہے۔ زندہ قومیں تو زندہ اسی کے دم سے ہیں۔ اور پھر مانا کہ ایک عیب آپ نے ٹٹول لیا۔ ننانوے ہنر بھی تو اس کے مقابلہ پر دیکھئے۔

شیخ صاحب ۔ وہی تو جاننا چاہتا ہوں، یہ مشین پر مشین جو دن پر دن ڈھلتی جاتی ہے، آخر اس سے کیا فائدہ دنیا کو پہونچ رہا ہے؟

مرزا صاحب ۔ میرے خیال میں پہلے یہ طے کر لیجئے کہ نفع یا فائدہ کہتے کسے ہیں؟

میر صاحب ۔ میں تو فائدہ سے مراد یہ لیتا ہوں کہ انسان کو زندگی میں راحت ملے، سکھ نصیب ہو۔

شیخ صاحب ۔ اور دکھ دور ہو ۔ ورنہ ایک راحت اگر دس مصیبتیں اپنے ساتھ لگا لائی تو یہ بھی کوئی علاج ہوا؟ اُلٹا اور وبال ہو گیا۔

میر صاحب ۔ یہ تو کھلی ہوئی بات ہے ۔ آگے چلئے۔

شیخ صاحب ۔ تو بس اپنے ہی قائم کئے معیار پر ان نت نئی کوششوں کو جانچ لیجئے ۔ ریل کا نام آپ پیش کریں گے؟ اچھا اس کو لیجئے۔ یہ فرمایئے کہ غلہ کی مستقل گرانی جو اب ہو گئی ہے کبھی ریل کے دور سے پہلے بھی تھی؟

میر صاحب ۔ سبحان اللہ ۔ ریل کا اس میں کیا قصور ۔ ریل تو قحط زدہ علاقوں میں غلہ پہونچا کر مصیبت ہلکی کر دیتی ہے۔

شیخ صاحب ۔ جی کیسی کچھ! ۔ اِدھر غلہ کھیتوں سے کٹ کر آیا نہیں کہ اُدھر مال گاڑیوں میں بھر بھر کر باہر چلا اور پھر ملک کے اندر اُلٹ پلٹ کر رہتا جب بھی غنیمت تھا، یہ خدا معلوم کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے ایسے میں گرانی نہ ہو تو کیا ہو؟

میر صاحب ۔ میں تو دیکھتا ہوں کہ مسوری اور نینی تال اور شملہ آناً فاناً پہونچا دینا ریل ہی کا کام ہے ۔ ریل نہ ہوتی تو ہم ترسا کرتے اور ان صحت بخش

مقاموں کی ہوا کبھی نہ لگنے پاتی۔

شیخ صاحب۔ اور ریل خود جو بیماریوں کا گھر ہے۔ یہ انجنوں کا بھکبھکاتا ہوا دھواں آپ کے خیال میں بالا بالا چلا جاتا ہے؟ سانس پر، پھیپھڑوں پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں پڑتا؟ نزلہ اس سے پیدا ہو جائے حلق میں خراش اس سے ہو جائے۔ کھانسی اس سے آنے لگے دق اور سل کی بنیاد یہ پیدا کر دے۔ کوئی ایسی ویسی چیز ہے۔ کسی بڑے جنکشن پر ذرا کچھ دیر کھڑے ہو کر تماشہ دیکھئے تو۔ بادل کے بادل ہیں کہ دھوئیں کے چھائے ہوئے جمے ہوئے۔ کپڑے الگ غارت۔ ہاتھ منہ الگ کالک میں لت پت اور کوئلہ کے ذرے ہیں کہ گھسے جا رہے ہیں آنکھ میں کان میں ناک میں۔ انجن والے بیچاروں کی تو وہ گت بن کر رہتی کہ سبحان اللہ۔ اللہ نہ کرے دشمن کا بھی یوں منہ کالا ہو۔

میر صاحب۔ آپ اپنی ہی کہے جائیے گا یا دوسرے کی بھی سنئے گا۔

شیخ صاحب۔ بات ابھی ختم کہاں ہوئی جو دم لوں، اپنی کالی کلوٹی کے گن ابھی آپ نے پورے سنے کہاں؟ اپنے کسی لمبے سفر کو یاد کر لیجئے۔ مسلسل جھٹکے اور دھچکے اور کمر توڑ ہچکولے، انسان کو پیس کر چور چور کر کے اعصاب چاہے فولاد کے بنے ہوں جب بھی انھیں دھول دھس کر رکھ دیں۔ پھر رات کے سناٹے میں کوس کوس دو دو کوس کے فاصلہ سے سن لیجئے کہ انجن گھڑ گھڑاتا ہوا، دھک دھکاتا ہوا زمین کا سینہ چیرتا ہوا چلا آ رہا ہے، جیسے جنگل کا کوئی دیو، چیختا، چنگھاڑتا، پھنکارتا ہوا آ رہا ہے۔ یہ جو آج اتنی کثرت سے عصبی اور خفقانی بیماریاں نکل پڑی ہیں ان میں کوئی ہاتھ ریلوے بازی کا نہیں؟ ذرا کسی محقق

ڈاکٹر سے تو پوچھ دیکھئے۔

میر صاحب۔ غرض یہ کہ دنیا جہان کی ساری خرابیاں ریل میں آکر جمع ہو گئی ہیں۔

شیخ صاحب۔ ابھی کیا ہے سُنتے جایئے۔ ہیضہ اور طاعون اور چیچک اور خدا جانے اور کون کون آپ ہی کے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ لگتی بیماریاں جتنی ہیں۔ یہ ملک الموتی وبائیں کہ ابھی کلکتہ میں تھیں ابھی بمبئی پہونچ گئیں ابھی مدراس میں نمودار ہوئیں، ابھی پیشاور میں جا نکلیں یہ سب آپ کی ریلوے ہی کی برکت نہیں تو اور کیا ہے اور پھر یہ تو ہوئیں جسمانی بیماریاں۔ باقی جہاں پہلے پہل آپ کی یہ سواری بادِ بہاری پہونچتی ہے وہاں اس کے جلو میں شراب خواری، ناچ گھر اور کیا کیا نہیں پہونچتا۔ کچھ اس کی بھی خبر ہے۔

میر صاحب۔ اور فائدہ ان ساری برائیوں کے مقابلہ میں آپ کو ایک بھی نظر نہ آیا۔

شیخ صاحب۔ ایک یہی فائدہ کیا کم ہے کہ پیروں کی قوت دن بہ دن جواب ہی دیتی چلی گئی۔ باپ دادا تیس تیس چالیس چالیس میل کی منزل پیدل مارنے والے، صاحبزادوں کے سامنے نام ۸۔۱۰ میل کا بھی لیجیے تو اوسان خطا ہو جائیں اور ایک ریل ہی کیا، آپ کے سائنس کو خدا سلامت رکھے موٹر اور ٹرام، لاری اور سائیکل اور موٹر سائیکل۔

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اور پھر آپ کے کارخانہ کی خوشبوؤں کا کیا کہنا۔ جس آلہ کو اُٹھا کر

دیکھئے ربڑ کی بدبو سے ناک لبس جائے۔ جس مشین کو چلایئے پٹرول کی گندگی سے دماغ اُڑ جائے۔ کیسی کیسی عطر بیز گیسیں کیا کیا شائستہ نواز ایسڈ اور تیزاب میرے شیر نے ایجاد کر ڈالے۔

مرزا صاحب۔ جی ہاں نفاست تو ختم ہے سائنس والوں پر۔ ان کی کسی لیبوریٹری میں کسی فیکٹری میں جا نکلئے ممکن نہیں رومال ناک پر نہ رکھ لینا پڑے۔ لیکن شیخ صاحب یہ آپ کی بھی زیادتی ہے کہ آپ سارا الزام ان ایجادوں ہی کے سر منڈھے دیتے ہیں بیجا مصرف جس چیز کا بھی کیجیئے وہ بری بن جائے گی۔ میرے خیال میں تو مشینوں کے استعمال کو صرف ضرورت کے وقت تک محدود کر دیا جائے تو ان کے نقصانات گھٹ تو یقیناً جائیں گے۔ چاہے بالکل دور نہ ہوں۔

میر صاحب۔ آپ بھی مرزا صاحب کس کی باتوں میں آگئے۔ ہمارے شیخ صاحب تو وہ ہیں کہ دن دوپہر آفتاب ہی سے انکار کر بیٹھیں۔ آنکھوں میں خاک جھونکنا اور کہتے کسے ہیں؟ وہ دن بھول گئے جب رات میں قدم گھر باہر نکالتے تو قدم قدم پر ٹھوکر کھاتے۔ یہ سائنس ہی کا کرشمہ ہے کہ شہر کا ہر گلی کوچہ پڑا جگمگا رہا ہے اور اب تو بجلی گاؤں گاؤں پہونچتی جا رہی ہے۔

شیخ صاحب۔ جی ہاں وہی بجلی کے لیمپ نہ۔ جن کی شان میں حضرت اکبر قصیدہ خوانی کر گئے ہیں۔

روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

یہ بھی فرما لیے کہ جب سے یہ روشنیاں نکلیں خاص لندن کی گلیوں میں جرموں کی تعداد گھٹی نہیں اور بڑھ ہی گئی۔ لندن کی نائٹ لائف

(شبانہ زندگی) پر تو مستقل کتابیں وہیں کے محققین نے لکھ ڈالی ہیں۔ کبھی ذرا انھیں اُٹھا کر دیکھ لیا کیجیے۔ "روشنی میں اندھیر" کے معنی سمجھ میں آجائیں گے اچھا جانے دیجیے، لندن اور پیرس کی اس تحقیق کو ذرا یہیں کے کسی مبصر سے پوچھ دیکھیے۔ کہ اتنی تیز تڑپ کا اثر اعصاب پر کیا پڑتا ہے؟ کیا خوب ترقی ہے! پہلے آنکھیں پھوڑیے، پھر آنکھوں کے علاج کے لئے عینکیں خریدیے! "روشن طبع" کا بلا ہونا تو شاعر کی زبان سے سُنا تھا اس روشنی برق کا بلا ہونا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں!۔

لکھے گا کلک حسرت دنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں!

میر صاحب۔ آپ تو ہر سیدھی بات کو اُلٹی کر دیتے ہیں۔ لیکن میں بھی دیکھتا ہوں کہاں تک ہٹ دھرمی سے کام لیجیے گا؟ ایک اس بات کو لے لیجیے کہ جب تک یہ پانی کے نل نہیں لگے ہیں، سقّہ بہشتی کا رونا جھیکنا کیسا گھر گھر مچا رہتا تھا اور اب وہی ہے کہ بے محنت، بے کھٹکے، پانی چلا آرہا ہے ڈول رسّی کا جھگڑا نہ پانی کھینچنے کی مشقت۔ مزے سے جب چاہا نل کھول دیا نہالیے۔ دھولیے۔

شیخ صاحب۔ جی کیا کہتے ہیں واٹر ورکس کی برکتوں کے۔ پانی تک نپ اور تُل کر بکنے لگا! یہ حد ہے ترقیوں کی جس دیس میں گلی گلی سبیلیں لگیں، اور جانوروں تک کے لئے پیاؤ چلا کریں وہاں آج دو دن کی دیر ہو جائے میونسپلٹی میں واٹر ٹیکس داخل کرنے کی، چلیے پانی بند! ترسا کیجیے حلق تر کرنے کو۔

مرزا صاحب ۔ اور یوں بھی تو پانی، وقت ہی وقت نل میں آتا ہے اتنے گھنٹے صبح، اتنے گھنٹے شام۔

شیخ صاحب ۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ صاف شفاف، بہتا ہوا، کھلا ہوا پانی چھوڑ چھاڑ بند گھٹا ہوا، طرح طرح کی ترکیبوں سے پکے پکائے ہوئے پانی میں آخر جان ہی کیا رہ جاتی ہے اور گرمیوں میں تو بس مزہ ہی جاتا ہے۔ وہ تپتے ہوئے بمبے اور دہکتے ہوئے نل، اور کھولتے ہوئے پانی کی دھار، برف کا سہارا نہ ہو، تو حلق جھلس کر رہ جائے۔

میر صاحب ۔ تو آخر برف کیوں نہ پیجئے؟ کیا ایسی نعمت پیسہ دو پیسہ سیر بھی مہنگی ہے؟

شیخ صاحب ۔ جی کیوں نہ پیجئے، بڑے شوق سے پیجئے، چاہے دانتوں پر معدہ پر اور اعصاب پر جو کچھ بھی بیت جائے۔ آخر برف بھی تو ہے نہ سائنس کی پیداوار، اور مشینوں سے تیار ہونے والی نعمت۔

میر صاحب ۔ خیر وہ کچھ بھی سہی یہ فرمایئے کہ ایسے شاندار اسپتال اس دور سے پہلے کب تھے، سامان راحت وہ ہے کہ گھر سے بڑھ کر آرام دہ۔

شیخ صاحب ۔ اور یہ نئی نئی بیماریاں، عصبی اور دماغی اور ہر ہر طرح کی جو اب نکل پڑی ہیں ان کے نام تک بقراط وجالینوس نے کب سُنے تھے؟ زہر خورانی کب اتنی عام ہوئی تھی؟ خودکشی کب آج کی طرح داخل فیشن ہوئی تھی؟ گندی سی گندی بیماریاں اپنے ہاتھوں کی پیدا کی ہوئی کب اس طرح انسان پر مسلط ہوئی تھیں؟ اور سب آڑ پکڑے ہوئے سائنٹفک ایجادوں اور آلوں کی۔

مرزا صاحب۔ اجازت ہو تو ایک اُصولی بات میں عرض کروں۔ مِل کے نام سے تو آپ دونوں واقف ہی ہیں وہی انگلستان کا مشہور فلسفی ایک جگہ لکھ گیا ہے کہ نیچر اور آرٹ کے درمیان نسبت تضاد ہے۔ یعنی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ میرے خیال میں کچھ ایسا ہی رشتہ نیچر اور سائنس کے درمیان بھی ہے۔ گویا جو چیز جتنی زیادہ انسانی سائنس کی شرمندہ احسان ہو گی اسی قدر وہ طبعی اور فطری حالت سے دور ہو گی۔ ہے یہ بات کہ نہیں؟

میر صاحب۔ یہ موشگافیاں تو میں جانتا نہیں۔ سیدھی سی بات یہ دیکھتا ہوں کہ دوربینوں نے آسمانوں تک کو چھان ڈالا ہے یوں کہیے کہ ستاروں کی مردم شماری، کر ڈالی ہے پھر یہ بھی سُن لیجئے کہ فلاں ستارہ اتنا بڑا ہے فلاں زمین سے اتنی دور ہے فلاں کی رفتار فی منٹ اتنی ہے واللہ یہ عجائبات ہیں عجائبات۔

شیخ صاحب۔ عجائبات کیوں؟ کہیے معجزات ہیں معجزات! قصور معاف یہ نہ ارشاد ہوا کہ اس ستارہ نوردی اور آفتاب گردی سے آخر حاصل کیا ہوا؟ انسانیت کی راہ کی کتنی منزلیں طے ہوئیں؟ یہ سائنس اور سائنسیں نہ معلوم ہوتیں، تو انسان کی تکمیل انسانیت میں کون سی کسر باقی رہ جاتی؟ وقت اور قوت کا صرف بے حساب، روپیہ کا خرچ بے شمار، اور پھر ہاتھ کیا لگا؟ مادی؟ روحانی؟ کچھ تو بتائیے اس لاحاصل دور بینی اور ستارہ پیمائی سے تو ڈلیا ڈھونا اور گھاس کھودنا کیا بُرا ہے؟

میر صاحب۔ کیا خوب! بس معلوم ہو گئی آپ کی قدردانی۔ یہ کوئی ترقی

ہی آپ کے خیال میں نہیں کہ خاک نشین انسان ہوا میں اُڑنے لگا طرح طرح کے اُڑن کھٹولے ایجاد کر لئے، ملکوں ملکوں کی سیر آناً فاناً کر ڈالی آپ کے نزدیک، یہ کوئی ترقی ہی نہ ہوئی۔

شیخ صاحب۔ اچھا تو معیار ترقی یہ ٹھہرا۔ مگر حضور والا' یہ ترقیاں تو آج سے نہیں، ہمیشہ سے حاصل ہیں۔ جنگل کی چڑیوں کو، درختوں پر گھونسلا بنانے والے پرندوں کو۔ چیل اور کوّے اور گدھ اور کبوتر اور باز سب ہی ہوا میں خوب فراٹے بھر لیتے ہیں، منزلوں کی خبر دم بھر میں لے آتے ہیں۔ حضرت انسان نے یہ بلند پروازی کے سبق جو کچھ سیکھے ہیں انھیں جانوروں کو دیکھ کر سیکھے ہیں۔ یقین نہ آئے تو فن ہوا بازی AVIATION کی جو سی کتاب چاہیے اُٹھا کر دیکھ لیجئے یہ اقرار درج ملے گا۔

میر صاحب۔ خیر اب آپ سے مغز کون خالی کرے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ جیسے جیسے عجیب اور نادر آلات جنگ آج جدید سائنس نے ایجاد کر لیے ہیں۔ رستم اور بھیم کے تو خواب و خیال میں بھی نہ آئے ہونگے۔

شیخ صاحب۔ یہاں تو میں بھی قائل ہو گیا سائنس کی استادی کا۔ واقعی بات ہے کہ خوب ہی سکھا دیا آپ کے سائنس نے بھائی کو بھائی کا پھاڑ کھانا۔ جسم کے ریشہ ریشہ کا قیمہ کر ڈالنا' ہاتھ' پیر' کان' آنکھ' ناک کے پرخچے اُڑا دینا' سائنس کی راہ سے جسم کے پور پور میں زہر اُتار دینا! آپ سے زیادہ مانتا ہوں کہ یہ حصہ ہے آپ کے سائنس کا! میں تو کہتا ہوں کہ یہ لطیف صنعتیں دیکھ کر جنگل کے شیر اور تیندوے اور ریچھ اور بھیڑیے، سانپ اور اژدہے سب اپنے کان پکڑ کر رہ گئے! کیا بات

ہے آپ کے سائنس کی۔ بات کی بات میں انسان کو درندوں سے بڑھ کر درندہ بنا ڈالا۔

مرزا صاحب۔ اور اصلی جوہر تو سائنس کا میدان جنگ ہی میں کھلتا ہے۔ اخباروں میں آپ نے پڑھا نہیں کہ ایک صاحب کرۂ مریخ کے نہیں اسی زمین کے دون کی لینے پر آئے تو بولے، خبردار، جو کوئی میرے قریب پھٹکا، اپنے خفیہ اور بے پناہ حربہ کا وہ ہاتھ دوں گا کہ بھاگتے راہ نہ ملیگی، ادھر سے حریف کے ڈائرکٹر آف سائنٹیفک ریسرچ نے گرج کر جواب دیا کہ مردود اس بھول میں نہ رہنا، یہ میرے محکمہ کے آٹھ سو سورما، نو ٹولیوں میں تقسیم۔ اپنا رات دن کس دن کے لئے ایک کئے ہوئے ہیں؟ عین وقت پر وہ شگوفہ چھوڑوں گا کہ دنیا دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی۔

شیخ صاحب۔ تو یہ کہئے۔

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

ہاں صاحب بڑھے جنوں کا اُتارنا کوئی دلگی ہے۔

مرزا صاحب۔ میرے خیال میں تو گفتگو کو بہت طول ہو چکا۔ اب مجلس برخاست ہو ہمارے میر صاحب کبھی کچھ پریشان ہو چکے ہیں۔

میر صاحب۔ نہیں پریشانی کاہے کی۔ البتہ رہ رہ کر حیرانی اس پر ہوتی ہے کہ ساری دنیا سے عنقا خیالات ہمارے شیخ صاحب ہی کے کیوں ہیں؟

مرزا صاحب۔ تو آپ کے خیال میں یہ بھی کوئی جُرم ہے؟

شیخ صاحب۔ اور جرم ہو بھی تو بندہ تنہا مجرم ہے کیا؟ اسکن اور کارپنٹر

اور خدا جانے کتنے تو یورپ ہی میں میرے ساتھ ہیں۔ باقی رہا ہندوستان تو کم از کم گاندھی جی کے انڈین ہوم رول کے اردو ترجمہ ہی دیکھ لئے جائیں۔

مرزا صاحب۔ لیکن میرے نزدیک تو کچھ زیادتی آپ کی بھی ہے شیخ صاحب۔

شیخ صاحب۔ وہ کیا۔ کھُل کر کہئے نہ؟

مرزا صاحب۔ زیادتی یہی کہ سائنس کو ایک سرے سے بُرا کہہ دیا جائے اور مطلب تو غالباً آپ کا بھی یہ نہیں۔ سائنس کو دراصل جس چیز نے اتنا بدنام کر رکھا ہے وہ اس کا غلط اور بیجا استعمال ہے نہ کہ سائنس بجائے خود۔ سائنس تو بس ایک قوت ہے۔ جیسے آگ، یا کسی پہلوان کا جسم اب اگر پہلوان اپنی طاقت کو زور و ظلم میں صرف کرنے لگے تو یہ خطا پہلوانی کی نہیں پہلوان کی ہوئی۔ آگ کو قابو میں رکھئے تو جو چاہے خدمت لے ڈالیے اور وہی آگ اگر بے قابو ہو گئی تو خود آپ ہی کو جلا ڈالے گی یہی حال سائنس کا ہے انسانیت کو اس پر حاکم رکھئے تو نعمت ہی نعمت اور جو کہیں اس کو انسانیت پر حاکم بنا دیا تو لعنت ہی لعنت۔

شیخ صاحب۔ اے تو زندہ باد! کیا خوب فیصلہ کر دیا۔ میں تو خود اسی نتیجے کی طرف لا رہا تھا۔ ہمارے ہاں کے حقیقت شناس تو صدیوں پیشتر یہی فیصلہ کر گئے ہیں ؎

علم را برتن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

علم کو کہیں آپ نے نفس کے تابع کر دیا تو وہ سانپ اور اژدہا بن کر رہے گا اور اگر عقل سلیم کے تابع رکھا تو اس سے بڑھ کر رفیق اور کون؟

آب در کشتی ہلاک کشتی ست

آب اندر زیر کشتی پشتی ست

پانی اگر کشتی کو اٹھائے ہوئے ہے تو رحمت ہی رحمت اور کہیں پانی کشتی کے اندر آگیا تو ہلاکت ہی ہلاکت۔

مرزا صاحب۔ سبحان اللہ، ایسے عارفوں کے کلام کا کیا کہنا۔ اچھا تو اجازت ہے نہ؟

میر صاحب۔ آداب عرض ہے۔

شیخ صاحب۔ خدا حافظ۔

---
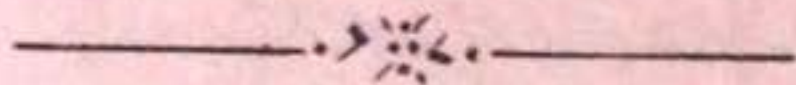
(۵) عیدِ قرباں[۱]

اللہ اللہ۔ دو مہینے دس دن کی مدت بھی کوئی مدت ہے۔ بات کہتے کٹ گئی اور شوال کی پہلی کی یاد ابھی مٹنے نہ پائی تھی کہ ذالحجہ کی دسویں آگئی۔ وہ مسلمان کی پہلی سالانہ عید تھی، یہ دوسری اور آخری۔ وہ عید الفطر تھی یہ عید قرباں یا عید الاضحیٰ (غلط العوام میں "عید الضحےٰ")۔ وہ عید میٹھی تھی آج کی عید نمکین۔ اس روز سوئیاں پی پلائی گئی تھیں آج قربانیاں ہوں گی۔ وہ جشن تھا اس کا کہ طاعت اور ضبط نفس کے پورے تیس دن ختم ہوئے اور نزول قرآن کی یادگار پورے مہینہ بھر منائی جاتی رہی تھی، آج خوشی اس کی ہے کہ نصیبے والے عین مرکز اسلام میں کعبۃ اللہ کے گرد چکر پر چکر کاٹ رہے ہیں، طواف و زیارت کی دولتوں سے مالا مال ہو رہے ہیں۔ پروانے شمع پر نثار ہو رہے ہیں۔ مکہ کی گلیوں میں، مکانوں میں دوکانوں میں، مسجد حرم کے صحن میں، دالانوں میں، حاجیوں کا زائروں کا ہجوم، منیٰ کے میدانوں میں خیموں میں، مکانوں

---

[۱] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ فروری سنہ ۴۰ء کی شام کو۔ وقت: ۱۵ منٹ۔

میں قربانیوں کی دھوم! پورے عشرہ کا عشرہ، چاند کی پہلی سے دسویں تک، وقف خیر و برکت کے لئے، نزول رحمت کے لئے۔ جس نیکی کی بھی توفیق پا جائیے۔ ہمیشہ سے زیادہ، معمول سے بڑھ کر ثواب لائیے، خود حاجی ہونا الگ رہا، حاجیوں کی نقل تک باعث اجر۔ ان کی طرح بال بڑھائیے، ناخن نہ ترشوائیے اس کا بھی اجر پائیے!۔

لبیک اللّٰھم۔ لبیک لبیک لاشریک لک لبیک تاریخ کی زبان سے روایت یہ سننے میں آئی ہے کہ آج سے کچھ اوپر پانچ ہزار سال قبل کلدانیہ کے ملک میں، بت پرستوں کی قوم میں بت تراشوں کے گھرانے میں ایک مقبول اور بہت مقبول، برگزیدہ اور نہایت برگزیدہ بندہ ابراہیم نامے آباد تھے۔ یہ کلدانیہ وہی ہے جسے انگریزی میں کالڈیا کہتے ہیں یا آج کی جغرافیائی اصطلاح میں عراق۔ بندہ کے امتحانات طرح طرح کے مالک کی طرف سے ہوئے اور ابراہیمؑ ہر آزمائش میں پورے اُترے۔ آخر اللہ کے پیغمبر ہی تھے۔ کچھ روز بعد حکم ہجرت کا ملا۔ سرزمین شام پر پہونچے اور پھر مصر ہوتے ہوئے حجاز کی خشک اور پتھریلی وادی میں آئے، علاقہ ویران۔ پانی کا نام نہ نشان۔ سبزہ کی جگہ ہر طرف ریگستان۔ نیچے تپتی ہوئی زمین اوپر دہکتا ہوا آسمان۔ حکم ملا کہ یہیں ایک گھر بناؤ اس مٹی اور پتھر کا "لیکن اپنے لئے نہیں، ہماری عبادت کے لئے" اور ہاں ذرا یہ کرنا کہ اسے منسوب ہماری ہی جانب کر دینا۔ ہم گھر اور در کی قید سے ماورا، مکان اور جہت کی نسبت سے بھی برتر و بالا، لیکن ذرا اسی گھر کے ساتھ ہمارا نام ڈال تو دو اور ہماری ہی بسائی ہوئی دنیا کو آواز دے دو کہ اس گھر کی طرف آجایا کرد۔ واذن فی الناس بالحج۔ فرماں بردار بندے نے پکار کر دی اور اس وقت پکار

کی، جب نہ تار تھا نہ ٹیلیفون نہ وائرلیس نہ لاؤڈ اسپیکر۔ نہ لوگ نشریات (براڈ کاسٹنگ) کے قانون سے واقف تھے نہ گھر گھر ریڈیو لگے ہوئے تھے۔ ابراہیمؑ کی پکار خدا معلوم کس لاہوتی میٹر پہ اور کس ملکوتی WAVE LENGTH سے نشر ہوئی کہ آج تک اس کی تھرتھراہٹ، فضائے کائنات میں آپ خود سُن رہے ہیں۔

حج کی تاریخ میں ابھی ہفتوں کا نہیں مہینوں کا زمانہ باقی ہے کہ دربار کی حاضری کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ اور اپنے اپنے گھر سے چل کھڑے ہوئے اپنے مالک و مولیٰ کے متوالے دنیا کے گوشہ گوشہ سے روئے زمین کے چپے چپے سے کوئی کابل سے کوئی قندھار سے کوئی مصر سے کوئی ایران سے کوئی عراق سے کوئی بخارہ سے کوئی سیلون سے کوئی جاوا سے کوئی افریقہ کے ویرانہ سے کوئی یورپ کے نشاط خانہ سے، غرض خلقت ہے کہ ہر چہار طرف سے اُمنڈی چلی آرہی ہے۔ یاتین من کل فج عمیق۔ کوئی ریل سے کوئی جہاز سے کوئی موٹر پر کوئی لاری پر کوئی پیدل کوئی سواری پر۔ کوئی غریب اپنی کمر کو کسے ہوئے اور کوئی صاحب اونٹ کی پیٹھ پر جمے ہوئے۔

کعبہ اسلام کا جغرافیائی مرکز ہے۔ مرکز کا ربط محیط کے گوشہ گوشہ سے دائرہ کے نقطہ نقطہ سے۔ دانا و بینا جوڑنے والے نے یوں جوڑا کہ ہر صاحب حیثیت پر عمر میں کم از کم ایک مرتبہ حج فرض کر دیا۔ حج کا رکن اعظم ہے نو ذی الحجہ کو میدان عرفات میں حاضری۔ سو وہ کل ہوگئی اب آج کا دن اسی سعادت کی خوشی منانے کا دن ہے۔ کلمہ گو جہاں کہیں بھی آباد ہیں آج جشن منائیں گے۔ لیکن اس مسرت کی غفلت میں دن چڑھے تک خراٹے لینے کے بجائے آج معمول سے اور سویرے اُٹھیں گے، غسل کریں گے،

اُجلے کپڑوں کے ساتھ بشاش چہروں کے ساتھ عیدگاہ روانہ ہوں گے اور واپس آئیں گے تو ان میں جو صاحب حیثیت ہیں وہ اچھے اور پاک صحیح اور تندرست جانوروں کی قربانی کا تحفہ اپنے پروردگار کے حضور میں پیش کریں گے خود اپنی طرف سے، اپنے عزیزوں کی طرف سے، بزرگوں کی طرف سے! اور جب کھانے کا وقت آئے گا تو تنہا نہیں کھائیں گے۔ بلکہ پہلے ایک تہائی محتاجوں، مسکینوں، مفلسوں کی نذر کر دیں گے ایک تہائی دوست احباب کی خدمت میں پیش کریں گے، جب کہیں ایک تہائی اپنے لئے رکھیں گے۔ عیدالفطر کے دن تاکید تھی کہ کوئی بدنصیب فاقہ سے نہ رہ جائے۔ عید قرباں کے دن ترغیب ہے کہ غریب سے غریب بھائی کی زبان کو کھانے پینے کی لذتوں کا کچھ تو مزہ آجائے۔

عیدالفطر سال گرہ تھی نزول قرآن کی، عید قرباں سال گرہ ہے بنیاد کعبہ کی۔ ابراہیمؑ موحد تھے۔ موحدوں کے سردار۔ توحید ہی کے جرم میں آگ میں جھونکے گئے تھے۔ ملک سے نکالے گئے تھے، حق تھا کہ اُن کی قائم کی ہوئی یادگار کے سلسلہ میں توحید ہی کا رنگ ہر رنگ پر غالب ہو اور سب سے نمایاں۔ آج آفتاب بلند ہوا کہ لگے لوگ عیدگاہ اور مسجدوں کی طرف چلنے اور لگے ہر طرف سے رب کی بڑائی کے نعرے بلند ہونے! سینوں کے اندر توحید کے ولولے، زبانوں پر تکبیر کے زمزمے۔ کیا خوب ظاہر ہے اور کیا خوب باطن۔ کیا خوب قال اور کیا خوب حال! —— عید کے دن یاد ہو گا، کہ تکبیریں صرف نماز عید کے ساتھ تھیں اور آمد و رفت کے راستہ میں۔ بقرعید کے موقع پر ایک نماز ایک وقت بلکہ ایک دن بھی اس جوش کے اظہار کے لیے کافی نہیں ابکی تکبیر شروع ہو گئی ۹ تاریخ

کی فجر ہی سے اور جاری رہے گی ہر نماز کے ساتھ ابھی تین دن اور یعنی ۱۳ رکی عصر تک۔ مرکز میں آج مسلمان اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے پکاریگا لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک "حاضر ہے اے میرے مالک و مولیٰ، یہ غلام حاضر ہے۔ یہ شہادت دیتا ہوا حاضر ہے" یہ آداب حاضری دینے والوں کے ہوئے۔ مرکز سے دور یا ہر والے ۹ ر سے ۱۳ ر کے سہ پہر تک، ساڑھے چار دن ہر نماز کے بعد پکاریں گے، اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ و اللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد "بڑائی تو آپ میں ہے صرف آپ میں ہے صرف آپ میں ہے آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بڑائی آپ میں ہے۔ صرف آپ میں ہے۔ ہمارے ہر شکر کی مخاطب آپ ہی کی ذات ہماری ہر مدح و ثنا کے سزاوار آپ ہی کے کمالات۔

مسلمان، قربانی کے لیے تیاری، دنوں، ہفتوں، مہینوں پیشتر سے کرے گا۔ پاک صاف جانور، اچھا تندرست بے عیب دیکھ کر خریدیگا۔ پالیگا کھلائے گا پلائے گا اپنے سے خوب ہلائے گا اور جب اس سے تعلق انس و محبت کا، رحمت و شفقت کا قائم ہوجائے گا، تو اپنے اور اس کے دونوں کے مالک کے حکم سے، اس تعلق پر اپنے ہاتھ سے چھری چلا دے گا۔ پالے ہوئے جانور کو پیار کی نگاہوں سے دیکھے گا۔ آخر وقت تک کھلائے پلائے جائے گا، لیکن جب حکم کی تعمیل میں زمین پر لٹائیگا تو قبلہ رُخ۔ منہ اس طرف کر کے جدھر وہ خود دن رات میں خدا معلوم کتنی بار جھکتا ہے گرتا ہے اور زبان سے کہتا جائے گا" انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین میں یہ کسی دیوی دیوتا کی بھینٹ نہیں چڑھا رہا ہوں۔ میرا رشتہ تو صرف اُسی سے جڑا ہوا

ہے۔ میں تو پجاری صرف اس کا ہوں جس نے پیدا کر رکھا ہے آسمان و زمین کو۔ میرا دستور زندگی تو تمام تر اس کے قانون کی پیروی ہے اِنَّ صلاتی ونسکی ومحیایَ ومماتی للہ ربّ العٰلمین میری دعائیں اور میری عبادتیں میری زندگی اور میری موت، نہ اپنے نفس کیلئے ہے اور نہ قوم اور اس ملک کے چھوٹے موٹے دیوی دیوتا کے لیے ہے اُسی کے حکم اور قانون کے تابع ہے جو پروردگار ہے ہر ملک کا ہر قوم کا ساری مخلوقات کا جمیع موجودات کا کل کائنات کا۔

ڈاکٹر جب مریض کو آپریشن کے میز پر لٹاتا ہے، تو پہلے آپریشن والے عضو کو دوا لگا کر سُن کر دیتا ہے یا مریض کو کلوفارم سُنگھا کر بے ہوش۔ مسلمان بھی جب جانور کو ذبح کے لئے قبلہ رُخ لٹا چکے، پر چھری چلاتا ہے تو روح کو ایک مختصر دو لفظی نغمہ سُنا، مست و مدہوش کر دیتا ہے۔ بسم اللہ اللہ اکبر! اے خاک کی مورت میں تجھے مردہ اپنی طرف سے نہیں کر رہا ہوں، میں تو خود تیری ہی طرح مخلوق تیری ہی طرح بے بس تیری ہی طرح خاکی تیری ہی طرح فانی۔ میں چھری چلا رہا ہوں اپنے اور تیرے پیدا کرنے والے کا نام لے کر اپنے اور تیرے مالک کے قانون کے ماتحت۔ زندگی کا عطیہ بخشنے والا بھی وہی اسے واپس لینے والا بھی وہی۔ جان ایک روز ڈالی بھی اُس نے اور آج نکالی بھی اُسی نے۔ بڑائی کا حقدار حکم چلانے والا صرف وہی!____ سُنتے ہیں کہ فوج کے سپاہی، جنگ کے میدان میں، فوجی بینڈ اور وطنی ترانہ کی آواز سُن کر، ایسے مست ہو جاتے ہیں کہ جان کی پروا نہیں رہ جاتی اور بندوق کی گولیوں توپ کے گولوں، سنگینوں کے وار کے لئے بے تکلف اپنے سر و سینہ کو پیش

کر دیتے ہیں ۔ اللہ کے نام کی کشش کیا روح کے لئے اتنی بھی نہیں؟

جاننے والے تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ روح اس اسم پاک سے ایسی مست و بیخود ہو جاتی ہے کہ خود حالت طرب میں ہنسی خوشی باہر آجاتی ہے، گو جسم دیکھنے والوں کی نظر میں تڑپتا لوٹتا رہ جائے ۔ آخر کلوروفارم کا آپریشن میں بھی تو یہی ہوتا ہے کہ رگوں پر رگیں جسم کی کٹتی رہتی ہیں خون پر خون بہتا رہتا ہے لیکن مریض کا احساس اذیت و کرب مردہ ہو جاتا ہے ۔ اللہ ٹھنڈی رکھے حضرت اکبر کی تربت کو کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

احساس ہی ایذا کا نہ ہوا فریاد و فغاں میں کیا کرتا
آنکھ اپنی لڑی تھی قاتل سے جس وقت نہ خنجر تھا گلا!

کہتے ہیں کہ ایک بار انھیں کعبہ کی تعمیر کرنے والے آگ میں کود پڑنے والے حج کی پکار کرنیوالے ابراہیمؑ نے بھی پیش کی تھی ۔ یہ قربانی بکرے کی نہ تھی مینڈھے کی نہ تھی اونٹ کی بھی نہ تھی، چہیتے اور لاڈلے نورِ نظر اسمٰعیلؑ کی تھی، خواب میں حکم، محبوب ترین ہستی کی قربانی کا ملا ۔ پیغمبر کے خواب بھی الہامی ہوتے ہیں ۔ صبح اٹھ مشورہ اسمٰعیلؑ سے کیا، اس سے کہا جو آنکھوں کا تارا، بڑھاپے کا سہارا تھا ۔ مشورہ خود اسی کے ذبح کے باب میں اس سے کیا ۔ دنیا کی تاریخ میں کب کسی عزیز نے عزیز سے اُس کے قتل و ذبح کے باب میں مشورہ کیا ہے؟ کب کسی شفیق اور عاشق زار باپ نے اپنے لختِ جگر کے سامنے یہ تجویز پیش کی ہے؟ ہر صاحبِ اولاد ذرا دِل پر ہاتھ رکھ کر سوچے ۔ بیٹا بھی کس باپ کا تھا؟ فوراً آمادہ ہو گیا اور عرض کیا " ابا جان آنکھوں پر پٹی باندھ لیجئے گا ۔ ایسا نہ ہو کہ عین وقت پر میرا چہرہ دیکھ آپکی ہمت جواب دے جائے ۔" باپ نے آنکھوں پر پٹی باندھ خدا معلوم دل پر کون سے پتھر کی سل رکھ حلق پر چھُری چلائی ۔ معاً قدرتِ حق سے نورِ نظر کی جگہ ایک جنت کے مینڈھے نے لے لی

اور چھری گو پھیرنے والے نے پھیری اسمٰعیلؑ کے گلے پر، لیکن چلی وہ اس غیبی مینڈھے کے حلقوم پر۔ اور اسمٰعیل علیہ السلام۔ وفدیناہ بذبح عظیم کا پروانہ بشارت پا زندہ جاوید ہو گئے!

آج کی قربانیاں یادگار ہیں اسی "ذبح عظیم" کی۔ زمانہ قبل اسلام کو چھوڑیئے۔ خود ادھر ساڑھے تیرہ سو برس کے اندر جتنی قربانیاں ہندوستان اور افغانستان ترکی و ایران مصر و عرب اور ساری دنیائے اسلام کے اندر ہو چکی ہیں۔ ان کا حساب و شمار ہے کسی حساب لگانے والے اور شمار کرنے والے کے بس کی بات؟ اللہ خود جسے "بڑی" قربانی کہہ کر پکارے کون اس کی بڑائی کی تھاہ پا سکے؟ کون اس کی وسعت و عظمت کی پیمائش کر پائے؟

آج کہنے کو عید نہیں بقرعید ہے۔ لیکن سماں بڑی حد تک اسی عید کا قائم۔ وہی گھروں میں دھوم دھام، وہی عیدگاہ میں اژدھام۔ عید سے بڑھ کر دعوتوں کے چرچے۔ عید سے کہیں بڑھ کر چٹ پٹے گرما گرم کبابوں کے مزے! ادھر ران بھن رہی ہے ادھر کلیجی تلی جا رہی ہے۔ کہیں سرخ سرخ پسندے سیخ پر لگ رہے ہیں، کہیں قورمہ اور قلیہ کے دیگچے اتر رہے ہیں کھانوں کی وہ خوشبو کہ بے بھوک کے بھوک لگ آئے۔ کھلانے والوں کی یہ آرزو کہ کوئی مفلس سا مفلس بھی دروازہ پر آ کر محروم واپس نہ جائے — گانا بجانا شریعت کے قانون میں ناروا۔ لیکن عید بقرعید کے موقع پر مناسب حدود کے اندر اس کلیہ میں استثناء۔ گھر گھر آج پیش ہو رہی ہیں عیدیاں اور مبارکبادیں اور فضا میں گونج رہی ہیں اللہ اکبر کی صدائیں۔ ریڈیو کا یہ کرم ہے کہ اس کے توسط سے ایک ذرہ پہونچ گیا تھا ہزارہا ہزار سننے والوں تک عید کا سلام اور آج نذر میں پیش ہو رہا ہے یہ بقرعید کا پیغام۔

(۶) محمد علیؒ[1]

نومبر کا مہینہ ہے اور شروع کی تاریخیں ۱۹۲۶ء۔ سہ پہر کے وقت کانپور اسٹیشن سے بمبئی لکھنؤ میل چھوٹنے کو ہے کہ دو شخص ندوہ کے سالانہ اجلاس سے موٹر پر بھاگو بھاگ اسٹیشن پہونچتے ہیں اور جھٹ پٹ ٹکٹ لے لوا، اسباب کچھ قلیوں اور کچھ والنیٹروں کی مدد سے پھینک پھانک سکنڈ کلاس کے ایک درجہ میں جا داخل ہوتے ہیں۔ دو انگریز بمبئی سے بیٹھے چلے آرہے تھے نو وارد دونوں ٹھیٹھ ہندوستانی۔ کھدر پوش، عبا پوش، داڑھی باز۔ ایک وجیہ و جامہ زیب، دوسرا کریہ و بدقطع۔ صاحب بہادر ان نوواردوں کا کینڈا دیکھ کچھ ہنسے کچھ مسکرائے۔ عجب نہیں جو یہ سمجھے ہوں کہ یہ بلا ٹکٹ گھس آئے ہیں یا دیل کے "بابو شاہی" روزمرہ میں "وِدآوٹ" (WITHOUT) والے ہیں۔

خوش قطع نو وارد نے اُسی برتھ پر قبضہ جما یا جس پر "صاحب" پہلے سے جمے ہوئے تھے۔ گاڑی چلی، اور گنگا کا پل بات کہتے آگیا۔ اِدھر پہیوں سے گھڑ گھڑ کی آواز آئی اُدھر صاحب بہادر ان دونوں دیسی آدمیوں کی طرف دیکھ چھیڑ کی

---

[1] یہ دہلی ریڈیو اسٹیشن ہے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۴۰ء کی شام کو۔ وقت ۱۵ منٹ۔

ادا سے مسکرائے اور منہ بنا کر بولے So this is Mother Ganges
یہی گنگا مائی ہے! طنز کا زور لفظ Mother پر تھا۔ پاس کا کھدر پوش معاً چائے
کی پیالی منہ سے ہٹا، انگریزی زبان میں اور ٹھیک انگریز کے لب و لہجہ میں بولا۔
"اچھا آپ سے دریا سے یہ رشتہ ہے؟ مرد آدمی یہ دریا کو مائی اور موسی
اماں اور خالہ کہنا کیا معنی؟" "صاحب" یہ تڑاق سا جواب پا سناٹے میں
آگئے ____ یہ تڑ تڑ جواب دینے والا تھا محمد علی اور اس کا ساتھی کہیے
یا "تابع مہمل" آپ کا خادم!

"صاحب" بیچارہ کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ چہرہ پر داڑھی اور سر پر پٹے رکھائے
ہوئے اور جسم پر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوئے ہندوستانی کچھ بھی انگریزی جانتا
ہوگا۔ چہ جائیکہ انگریزی میں جواب دے سکے اور وہ بھی ایسا شستہ و برجستہ!
کچھ دیر غوطہ میں رہے پھر ادھر سے منہ پھیر کر گفتگو اپنے پرانے ہمجنس رفیق سفر
سے کرنے لگے۔ اتفاق سے موضوع گفتگو تھا کرکٹ۔ ولایت سے مشہور ٹیم ایم، سی،
سی، نئی نئی ہندوستان میں آئی ہوئی تھی دونوں صاحب بہادر لگے آپس میں
یہ گفتگو کرنے کہ فلاں کھلاڑی ایسا ہے اور فلاں ویسا۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ
محمد علیؔ سے نہ رہا گیا بول اٹھے۔ "دخل در معقولات معاف آپ رائے زنی میں بڑی
زیادتی کر رہے ہیں" اور لگے تفصیل اور تشریح کرنے کہ فلاں میں یہ خوبی ہے اور فلاں میں
یہ خرابی۔ ہوتے ہوتے تبصرہ نفس کرکٹ پر شروع ہو گیا اور بیان ہونے لگی گویا انگلستانی
کرکٹ کی پوری تاریخ، بولنے والا اب گفتگو کیوں کر رہا تھا یوں کہیے کہ کسی انسائیکلو
پیڈیا کا آرٹیکل کرکٹ پر سنا رہا تھا۔ صاحب بہادر فرط حیرت سے دم بخود کہ یا
الٰہی یہ کس قیامت کا انسان ہے کہ شکل ملاؤں کی سی اور ماہرانہ معلومات اور
فنی تنقید میں کرکٹ بازوں کا بھی استاد! آخر سنتے سنتے گھبرا کے ایک بار بولے "آپ
کو بڑے ہی معلومات کرکٹ سے متعلق ہیں!" انھوں نے کہا "ایسے معلومات

ایک مجھی کو کیا، ہر علی گڑھ والے کو ہوتے ہیں۔" وہ بولا اچھا تو آپ علی گڑھ کے پڑھے ہیں کپتان رہے ہوں گے۔" بولے جی نہیں کپتان تو بڑے بھائی (Big Brother) تھے۔" یہ شوکت علی صاحب کے لئے Big Brother کی اصطلاح خود محمد علیؒ کی چلائی ہوئی تھی اور سارا انگریزی پریس اس سے واقف ہو چکا تھا۔ صاحب بہادر نے اپنے نزدیک گویا بڑی پہیلی بوجھی اور بول اُٹھے you talk like Mohammad Ali "یہ تو آپ محمد علی کی زبان بول رہے ہیں" یہ بولے I am Mohammad Ali زبان کیسی میں خود محمد علی ہوں!۔

صاحب کی حیرت اب دیکھنے والی تھی۔ آنکھیں پھاڑے اور نظر اس کھدر پوش کے چہرہ پر گڑوئے ہوئے بولے Really! one of the two Ali Brothers کیا واقعی؟ وہی محمد علیؒ جو علی برادران میں سے ایک ہیں۔" اُنھوں نے چمک کر جواب دیا yes, the younger and more sharp - Tounged of the two ہاں جی وہی بھائی جو دونوں میں چھوٹا اور زبان کا زیادہ تیز ہے۔ صاحب کو اب کی اپنی حیرت کو دور کرنے میں دیر سکنڈوں کی نہیں شاید منٹوں کی لگی۔ بےچین اور بیقرار پہلو پر پہلو بدل رہے ہیں اور ٹکٹکی ہے کہ محمد علی کے چہرہ کی طرف لگی ہوئی۔ محمد علی نے یہ جو دیکھا تو صاحب بہادر کو اور گڑبڑانا شروع کر دیا۔ بولے "یہ میرا نام سن کر آخر اتنی گھبراہٹ کیسی؟ کیا یہ خیال تھا کہ علی برادران جہاں کہیں کسی انگریز کو دیکھ پاتے ہیں بس اس پر جھپٹ پڑتے ہیں؟ تو اطمینان رکھئے اطمینان دیکھ نہ لیجئے (ہاتھ پھیلا کر) یہ میرے ناخن تک ترشے ہوئے ہیں حملے وملے کا تو خیال بھی دل میں نہ

لائیے۔ صاحب کے ہاتھ میں بمبئی کا مشہور انگریزی روزنامہ ٹائمز آف انڈیا[1] تھا اسے بڑھا کر کہا "اچھا ان الزامات کا کیا جواب ہے، جو یہ ہر روز آپ پر لگاتا رہتا ہے؟" محمد علی نے پرچہ کو چھوا تک نہیں۔ بولے "اسے تو آپ ہی پڑھتے ہیں پرچہ کو نہیں، پرچہ کے اڈیٹر کو خوب پڑھ چکا ہوں۔ آکسفرڈ میں میرے زمانہ میں تھا۔ مجھ سے پیچھے۔ آتا جاتا اس کو اُس وقت بھی کچھ نہ تھا اور نہ اب ہے۔ گلہ ہو اور گلہ بان نہ ہو تو نہ سہی لیکن عجب تماشہ ہے کہ اس کا کوئی گلہ نہیں اور کہتا اپنے کو گلہ بان ہے[2]!

یہ سارا لطیفہ تھا، اڈیٹر صاحب کے نام Mr. Shippard پر۔ داستان خاصی طویل ہو گئی ایک ہی قصہ کو کہاں تک سُنے جایئے گا، چھوڑیئے یہیں اس قصۂ ناتمام کو۔

سنہ ۱۹۲۰ء ہے۔ محمد علی، وفد خلافت لے کر یورپ گئے ہوئے ہیں، کوئی سُننا نہیں چاہتا اور یہ ہیں کہ اپنی سُنائے چلے جاتے ہیں۔ لندن میں ایک جلسہ میں تقریر کا موقع ڈھونڈ نکالا۔ کن مشکلوں سے اجازت پانچ منٹ کی ملی کہنے کھڑے ہوئے کہ "حضرت! یہ تو سُن لیجئے کہ میں آ رہا ہوں چھ ہزار میل کے فاصلے سے اور ترجمانی مجھے کرنا ہے ۳۰ کروڑ انسانوں کے خیالات

---

[1] یاد رہے کہ یہ ذکر ۲۶ء کے ٹائمز آف انڈیا کا ہو رہا ہے جو خالص انگریزوں کا پرچہ تھا اور جسے اس نام کے موجودہ اخبار سے کوئی نسبت نہیں چیف ایڈیٹر کا نام Shippard تھا۔

[2] الفاظ کچھ اس قسم کے تھے THERE ARE MANY A SHEEP WITH OUT A SHEPHERD, BUT HE IS A SHEPHERD WITH OUT A SHEEP.

کی۔ اب آپ خود ہی حساب لگا لیجئے کہ فی منٹ نہیں فی سکنڈ بھی نہیں ہر سکنڈ کی کسر میں میں کتنوں کے خیالات وجذبات آپ تک پہونچاؤں گا۔ مجمع سے آوازیں آنے لگیں آپ کہے جایئے کہے جایئے اور ہر پانچ منٹ کے بعد پانچ ہی پانچ منٹ اور بڑھتے رہے یہاں تک کہ پورے بیس منٹ ہوگئے! ـــــ لندن کی مجلسوں میں ایک ایک منٹ جتنا قیمتی ہوتا ہے۔ اس کے اندازہ کے بعد ہی محمد علی کے اس کمال کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اسی سفر لندن کا ایک اور منظر۔ مولانا مخالفین کے مجمع میں تقریر یہ کر رہے ہیں کہ "صلح کے وقت استنبول کس طرح چھوڑ سکتے ہیں۔ تقریریں اور سمرنا تو پھر غنیمت ہیں۔ لیکن استنبول سے تو ہماری تاریخ وابستہ ہے ....." یہیں تک پہونچے تھے کہ ایک گوشہ سے ایک تاریخ داں صاحب کی آواز آئی "یعنی یعنی" استنبول آخر کب سے آپ کے قبضہ میں ہے؟ سوال کا مطلب یہ تھا کہ اسلام کی تاریخ تو بہت پرانی ہے اور استنبول پر مسلمانوں کا قبضہ بہت بعد کو ہوا ہے۔ جواب میں کیا دیر تھی، کھٹ سے ارشاد ہوا کہ "کوئی فاضل تاریخ مجھ سے سنہ دریافت کر رہے ہیں۔ اس وقت بس اتنا یاد ہے کہ جب سے آپ کے پاس ہندوستان ہے، اس کے تگنے زمانہ سے ہمارے پاس استنبول ہے!" جلسہ لوٹ لوٹ گیا اور فاضل تاریخ کی آنکھیں پھر نہ اونچی ہوئیں۔

مہاراجہ الور، جو ابھی کل تک زندہ تھے، ابھی تو بہت سے لوگ ان سے واقف ہوں گے۔ سنہ ۲۶ء میں ایک بار مہربان ہو مولانا کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ انگریزی کے تو ماہر تھے ہی، فارسی کا بھی اچھا مذاق رکھتے تھے، شاعر تھے وحشی تخلص تھا پہلی ملاقات میں اپنا دیوان مولانا کو

پیش کیا، تو اس پر یہ الفاظ لکھ دیئے۔ to my Maulana
from his Wahshi "اپنے مولانا کی خدمت میں اُن کے وحشی
کی طرف سے" یہاں کیا دیر تھی۔ جب سے جامعہ ملیہ کا نصاب اپنا
تیار کیا ہوا نکال چٹ اس پر یہ سطر لکھ، سارا قرضہ، دم نقد چکا دیا
From a Bogus Maulana to a real Maharaja
"ایک نام کے مولانا کی طرف سے ایک کام کے مہاراجہ کی خدمت میں!

لطائف و ظرائف اس طرح کے کوئی دو چار، دس بیس ہوں تو کہے جائیں یہاں تو
اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے معمول ہی یہی تھا ــــ کہاں تک سنئے گا؟ اور
کوئی کہاں تک سنائے گا؟ سُننا اور سُنانا الگ رہا، کسی کو یاد ہی کب رہ سکتے
ہیں؟ اور یاد کو بھی چھوڑ دیجیے یہی کیونکر ممکن تھا کہ کوئی سال کے ہر دن اور ہر
دن کے چوبیس گھنٹے، ہمزاد بنا، ساتھ ہی ساتھ لِئے اور چپکا رہے؟ ہا!
جس قبر میں قوم و ملت کی بیشمار آرزوئیں اور ولولے مدفون ہیں وہیں آج ہزارہا
ہزار ادبی لطیفے اور چٹکلے بھی زیر خاک ہیں۔

مناسبتِ لفظی کے بادشاہ تھے۔ قوت حافظہ بلا کی تھی برجستگی اور حاضر
جوابی تو کہنا چاہیے کہ اُن پر ختم تھی ــــ چاہے کسی والیِ ملک کے دربار میں
ہوں، وزیر برطانیہ کے ہاں باریاب ہوں، وزیر ہند کے سامنے ہوں،
شاہِ حجاز کی مجلس میں ہوں، جامع مسجد کے منبر پر ہوں، عدالت کے کٹہرے
میں مجرم کی حیثیت سے کھڑے ہوں، کہیں اور کسی حال میں ہوں، اپنی آمد
طبع سے نہ چوکتے۔ حد یہ ہے کہ شدید غصہ کی حالت میں بھی ذہانت کند نہ
ہوتی بلکہ اُس پر جلا ہو جاتی۔ ایک بار کیا ہوا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ
دہلی میں حکیم صاحب کے مکان پر ہو رہا ہے۔ محمد علی بیمار و معذور لیٹے

ہوئے ہیں۔ مخالف صف میں ایک اور مشہور لیڈر رہیں۔ یہ بھی ایک روزنامہ کے مالک ہیں، ان کے ہمراہ ان کے نفس ناطقہ روزنامہ کے اڈیٹر صاحب بھی ہیں۔ اور صاحبزادہ بھی۔ بحث نے طول پکڑا۔ گرماگرمی نے زبانوں پر چھالے ڈال دیئے۔ سوال وجواب کی تلخیوں نے منہ کے مزے خراب کر کر دیئے۔ آخر وہ تینوں صاحب ناخوش ہو جلسہ پر لعنت بھیج اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ادھر وہ اُٹھے ادھر محمد علی نے پکار کر کہا عضب ہو گیا، باپ بیٹے رسّی القدس تینوں کے تینوں خفا ہو گئے۔

ذہانت کے لئے بڑا میدان شعروشاعری کا تھا، محمد علی شاعر بھی تھے اور شاعری کی دنیا میں نام تھا جوہر۔ بڑے بھائی کا تخلص گوہر تھا۔ فرماتے تھے کہ منجھلے بھائی شوکت بے تخلص رہے جاتے ہیں، ان کے لئے تجویز کرتا ہوں، اسی وزن وقافیہ میں شوہر! —— بیشک عروس سخن کو ایسا شوہر کبھی کیوں ملنے لگا تھا۔

شیفتہ کی مشہور غزل ہے "پشیمانیوں میں ہم، نادانیوں میں ہم" اس پر غزل کہنے بیٹھتے تو مطلع ارشاد ہوتا ہے ؎

کیوں شہر چھوڑ جا پھنسیں دہقانیوں میں ہم
مجنوں کے ساتھ ہو گئے بیابانیوں میں ہم

علی گڈھ کے مشہور خاندان شروانی سے تعلقات بڑی بے تکلفی کے تھے اس کے ایک معزز فرد تصدق اللہ خاں شروانی کی زبان سے کہتے ہیں ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہیں عقل بھی کبھی شیروانیوں میں ہم

خود بیجا پور جیل میں تھے۔ بڑے بھائی لحیم شحیم راجکوٹ جیل میں پڑے پڑے دُبلے ہو گئے تھے ان کی زبان سے ادا کیا ہے ؎

شوکت یہ کہتے ہیں وہ تن و توش جب نہیں
پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم

ابھی نوجوان ہی تھے کہ علی گڑھ کالج میں زبردست اسٹرائک ہوئی اور کل کچھ ایسی بگڑی، کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب کالج ہی کا دم واپسیں آپہنچا۔ سرسید کی برسی کا دن آیا، اور عین اسی دن اولڈ بوائز نے اپنا سالانہ جلسہ منانا طے کیا۔ محمد علی آتے ہیں، اور ایک منظوم عرضداشت سرسید کی روح کی خدمت میں اپنے ہی جیسے بڈھے لڑکوں کو سنا کر پیش کرتے ہیں دو ایک شعر ملاحظہ ہوں ؎

خبر لو قوم کی کشتی کی گو گشتی سے باہر ہو
ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو

سرسید کے عقائد مذہبی ملحوظ خاطر رہیں ؎

یہاں مانا کہ تاثیرِ دعا میں شک رہا تم کو — وہاں ضائع نہ ہو گی پھر بھی مشغول دعا تم ہو
سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا — جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اسکی ابتدا تم ہو

ردیف دال کی یہ غزل کیسی چل گئی ہے اور ہر شعر کیسا بولتا ہوا ہے ؎

روز حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے — میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل ہی بن گیا ہے ؎

قتل حسین رضؓ اصل میں مرگ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کا گھر گھر اس گیت سے گونج رہا تھا ؎

بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دیدو

یہ جیل کے باہر تھا۔ جیل کے اندر خود محمد علی کیا کر رہے تھے؟ یہ کہہ رہے تھے ؎

تم یونہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے پر غیب سے سامان بقا میرے لئے ہے
پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؓ کو خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے
میں کھو کے تری راہ میں سب دولت دنیا سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

یہ شاعری نہیں آپ بیتی کا ٹکڑا تھا۔ قال نہیں، سراسر حال ؎

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

خوش نصیب تھے وہ جنھوں نے محمد علی کو دور سے، سردار قوم کی حیثیت سے جانا، پیشوائے ملت کی حیثیت سے پہچانا۔ خوش نصیب تر تھے وہ جنھوں نے قریب سے دیکھا۔ بہ حیثیت دوست کے، عزیز کے، انسان کے، ان دیکھنے والوں نے کیا کچھ دیکھ لیا، کیا کچھ پا لیا، ایک صداقت مجسم، پیکر اخلاص، جرأت ہمت و بے خوفی کا مجسمہ! پاس والے جتنا قریب سے دیکھتے گئے جوہر کے یہی جوہر اور زیادہ کھلتے گئے، ابھرتے گئے نکھرتے گئے، کہتے ہیں کہ اہل سیاست وہ ہوتے ہیں جو کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں اگر یہ سچ ہے تو محمد علی قطعاً سیاسی نہ تھے ایک بار نہ تھے ہزار بار نہ تھے محبت کے پتلے تھے۔ مہر و الفت کے بندے۔ بیوی بچوں دوستوں رفیقوں کے عاشق زار، عزیزوں کے جاں نثار، اجنبیوں تک کے مونس و غمگسار۔ کہا کرتے تھے کہ شہرت میں کیا رکھا ہے میں تو محبت کا بھوکا ہوں عالم اسلام

کے ساتھ شیفتگی کا یہ عالم، افریقہ میں کسی کے تلوے میں کانٹا چبھے اور اور اس کی چبھن محمد علی دہلی میں بیٹھے محسوس کریں۔ "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔" کسی کے حق میں شاعری ہو گی ان کے حق میں واقعہ۔ لوگوں کو مہمان بنانے، کھانا کھلانے، خاطریں کرنے کے حریص۔ خود اپنے گھر میں مفلسی و ناداری مہمان اور دوسروں کو پکڑ پکڑ کر لا رہے ہیں اور زبردستی کھانا کھلا رہے ہیں!

لڑکا کوئی نہ تھا، لڑکیاں چار۔ ایک سے بڑھ کر ایک لاڈلی۔ ۲۳ء میں ابھی جیل میں تھے کہ منجھلی لڑکی جوان شادی شدہ دق میں مبتلا ہو گئی اور مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ مجبور و محصور صدہا میل دور، باپ پر کیا گزر رہی ہوگی! جو دوسروں کی اولاد کے لئے تڑپ جانے والا تھا، وہ اپنی نازوں کی پالی، نورِ نظر کے واسطے کیسا کچھ بلبلایا ہو گا، تلملایا ہو گا پھڑ پھڑایا ہو گا! کچھ اور زور نہ چلا تو عالم خیال میں بیٹی سے کہنے لگے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں — تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

اور پھر اپنے دل کو یوں سمجھانے لگے ؎

امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا — جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلا — اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نورِ نظر، دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر عرض کر رہے ہیں ؎

تو تو مُردوں کو جِلا سکتا ہے قرآں میں کیا — تخرجُ الحیّ من المیّتِ مذکور نہیں

تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم — آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ تقدیر کا نوشتہ کسی علاج و تدبیر سے مٹ نہیں سکتا۔ شعر کہنے سے پہلے کلیجہ ہاتھوں سے تھام لیتے ہیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اُسکو — نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

ایک نہیں دو دو جوان پہاڑ سی لڑکیوں کا جنازہ اپنے ہاتھوں اُٹھایا، قبر میں اُتارا، سُلایا۔

دل ذاتی صدموں کی تاب کہاں تک لاتا۔ قومی صدمہ اُن سے بھی بڑھ چڑھ کر۔ ۱۹۲۴ء میں ترکوں نے خلافت نہیں توڑی محمد علی کا جگر پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ جئے اس کے بعد برسوں۔ اور بہت سے زندوں سے بڑھ کر اپنی زندگی کا ثبوت دیتے رہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ نہ پنپنا تھا نہ پنپے۔ ہنسے بھی بولے بھی گرجے بھی لیکن اندر ہی اندر برابر گھلتے رہے پگھلتے رہے سُلگتے رہے۔

پروردگار سے اتنا ربط و تعلق کم دیکھنے میں آیا ہے۔ قرآن پڑھنے بیٹھے تو قرآن ہی کے ہو جاتے۔ جہاں یہ مضمون آجاتا کہ ڈرنے کی چیز بندے نہیں اللہ ہے تو آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور ان آیتوں کو بار بار پڑھتے۔ ان الحکم الا للہ تو گویا تکیۂ کلام تھا۔ سورہ یوسف کی آیت ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار کو فرمائش کر کر کے سنتے اور وجد کرتے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی خود گزشتہ تقریر میں شہادت دی ہے کہ کانگریس کا رزولیوشن ہو کوئی تقریر ہو، کچھ ہو کمال تھا محمد علی کو کہ ہیر پھیر کر خدا کا نام ضرور لے آتے تھے۔ آخر آخر دل سب کی طرف سے ٹوٹ گیا تھا اور خود

اپنے مصرعہ کی تفسیر ہو کر رہ گئے تھے"۔ ع

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

جنوری ۱۹۳۱ء کی ۴ر اور ۵ر کی درمیانی شب مسلمانوں کے ہاں پندرہویں شعبان کی مبارک شب تھی اور روئے زمین کے مسلمان ذوق و شوق سے جان کی، ایمان کی، دنیا کی اور آخرت کی، دونوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے کہ اس برکت والی رات میں مشیت الٰہی نے اپنی یہ نعمت اُن سے واپس طلب کر لی۔ شاید اس لئے کہ محمد علی کے اہلِ وطن و اہل ملت اس نعمت کے اہل ثابت نہ ہوئے۔ جان لندن میں جان آفرین کے سپرد کی اور آخری آرامگاہ کے لئے جگہ کہاں نصیب ہوئی؟ قبلۂ اول میں، ہیکل سلیمانی کے قریب، جامع عمرؓ سے متصل! اقبالؒ کو الہام ہوا۔ ع

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

ماتم و شیون کی صدائیں ملک کے ایک ایک گوشہ سے ایک ایک شہر ایک ایک قصبہ ایک ایک گاؤں سے اور ہندوستان ہی نہیں سارے عالم اسلامی میں اس زور و شور سے اُٹھیں اور اتنے روز تک رہیں کہ تاریخ میں مثال مشکل ہی سے ملے گی" ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لئے ہے" انھیں کا مصرعہ ہے اور یہ بھی فرما گئے ہیں ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

---

(۷) شب برات

بات آج کی نہیں، کوئی ۳۵ - ۳۶ سال اُدھر کی۔ جاڑوں کا زمانہ اور چاند کا یہی مہینہ، یہی راتیں اور یہی تاریخیں۔ ۱۰ - ۱۱ سال کا ایک لڑکا شبرات منا رہا ہے۔ ارگرد حالی موالی جمع۔ آتشبازی ٹوکری میں جمع ہوئی، کچھ چھُٹ رہی ہے، کچھ رکھی ہے، اِدھر چھچھوندر اور انار، اُدھر مہتابی کی بہار۔ اتنے میں خدا جانے کیا جوگ پڑتا ہے، چراغ کا گُل آتشبازی کے ٹوکرے پر گرتا ہے یا کیا، کہ یک بیک سارے ذخیرہ نے بھک سے آگ پکڑ ہی تو لی۔ کوئی چیخا، کوئی بھاگا۔ اور قریب تھا کہ ہنسی کھیل کا تماشہ درد و غم کا حادثہ بن جائے۔ توبہ! آگ کا کھیل بھی کوئی کھیل ہے! بارے آئی گئی ایک پانچ برس کے غریب لڑکے پر ہوئی۔ خوب جلا، جھلسا، بھلسا، مہینوں مرہم پٹی ہوئی جب کہیں جا کر دوبارہ زندگی پائی۔

جگ بیتی نہ تھی، آپ بیتی تھی، اُس وقت کا آتشباز لڑکا اِس وقت

لے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن - ۱۴ ستمبر ۱۹۴۸ء کی شام کو۔ وقت : ۱۵ منٹ۔

تقریر و بیان کی پھلجھڑی چھوڑنے حاضر ہے! ہول ایسا اُس گھڑی سے دل میں سمایا کہ پھر کبھی آگ اور دھویں کا سوانگ ہی نہ رچایا۔ آنکھوں دیکھے نہ سہی، کانوں سُنے واقعات، ایسے بلکہ اس سے بڑھ چڑھ کر واقعات آپ کے علم میں بھی بارہا آچکے ہوں گے۔ اخباروں میں تو کوئی سال ناغہ ہوتا نہیں، جو یہ خبریں نہ چھپتی ہوں کہ اب کی شبرات میں فلاں شہر میں بچے اتنے جلے اور بوڑھے اتنے مرے!۔

تو ایک شبرات تو یہ ہوئی کہ رات بھر روپیہ خوب پھونکا، اُڑایا، ہوا میں خوب ہی بدبو پھیلائی پوٹاس کی، مینسل کی، بارود کی، نہ خود سوئے نہ کسی کو سونے دیا، دھنا دھن، پھٹا پھٹ سے محلہ والوں کی نیند حرام کردی۔ بیماروں اور اُن کے تیمارداروں سے خوب خوب کوسنے حاصل کئے اور جو روپیہ کہیں قرض کا ہوا، جب تو سچ مچ "گھر پھونک تماشا دیکھا"۔ پھر ایک ہی رات نہیں، آتشبازی (ٹھیٹھ ہندوستانی ترجمہ "آگ کا کھیل") کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے کئی دن پہلے سے اور جاری رہتا ہے کئی دن بعد تک! ہندوستان کے لق ودق ملک کے ایک ایک شہر ایک ایک قصبہ اور ایک ایک گاؤں میں ہر سال جتنا روپیہ اس مد میں اُٹھتا ہے، پھنکتا ہے، دھواں بن کر اُڑتا ہے، سب کی میزان کوئی لگانے بیٹھے تو عقل چرخ ہوجائے۔

آتشبازیوں کا تو اصلی وقت رات کا وقت ہوتا ہے، لیکن حلوے کی تیاریاں دن ہی سے پوری طرح شروع ہوجاتی ہیں۔ میوہ آرہا ہے، سوجی آرہی ہے، چنے کی دال پس رہی ہے، شکر کی بوریاں چلی آرہی ہیں۔ گھی ترازو میں تُل رہا ہے، پتیلے صاف ہو رہے ہیں۔ کہیں خود گھر

والیوں، کہیں اُن کی ماماؤں اصیلوں کی جوتیوں کی سٹ سٹ، دیگچوں میں کفگیروں کی کھن کھن، ہر گھر میں ایک عجیب چہل پہل، بڑے اور چھوٹے سب مگن۔ بچے کود رہے ہیں، دوڑ رہے ہیں، زقند بھر رہے ہیں۔ عورتیں نہال ہوئی جارہی ہیں۔ شب برات گویا واقعی بارات کی رات! شام کو "نیاز" ہوگی، اور "خوش عقیدگی" کی دنیا میں مُردوں کی روحیں آئینگی! جب نام آگیا فاتحہ درود کا، تو کس کے منہ میں زبان ہے جو حرف گیری پر کھلے اور اپنے لئے خطابات حاصل کرے "وہابی" کے، مردود کے؟

لیجئے شام ہوگئی اور میٹھا تیار ہوگیا، کہیں خشک اور کہیں تر۔ ساتھ ساتھ "توشہ کی" روٹیاں بھی حاضر، تنوری یا خمیری، اور کھاتے پیتے گھروں میں شیرمال بھی! قسمت جاگ گئی تکیہ داروں کی، نصیبے کھل گئے تکیہ دارنوں کے!

حلوے کی قتلیاں کٹنے لگیں، قلاقند کی لوزیات رکیبوں کی شکل میں ڈھلنے لگیں۔ سینیوں میں، طباقوں میں، خوانوں میں جمنے لگیں۔ ناریل کے لچھے کترے ہوئے، پستہ کی ہوائیاں پڑی ہوئی، بادام، کشمش طرح طرح کے میوے، کیوڑے کی خوشبو دماغ مہکائے ہوئے، چاندی کے ورق جھمجھاتے ہوئے۔ فاتحہ کا ثواب سیدالشہدا حضرت امیر حمزہ رضؓ کی روح کو خدا معلوم کس طبع زاد تاریخ اور خانہ ساز تحقیق کے مطابق آج ۱۴ شعبان کو فرض کرکے بخشا گیا، اور پھر گھر کے سارے مُردوں کو۔ نام ایک ایک کے یاد کرکر کے، حافظہ پر زور ڈال ڈال کے لئے گئے، اس کے بعد حصّے تقسیم ہونے شروع ہوئے، عزیزوں، دوستوں، محلہ والوں، برادری والوں، گھر کے خدمتیوں، چاکروں سب میں؛ اور گھر کے لڑکے اس سے

پہلے ہی کچھ نوچ کھسوٹ لے بھاگے۔ حصہ باہر سے آرہا ہے، حصہ اندر سے جارہا ہے، نائیوں اور نائنوں کی بن آئی ہے۔ سر پر خوان اور خوان میں حصے۔ گھروں میں اور سڑکوں پر آمد و رفت، بازاروں میں رونق، حلوائیوں اور نانبائیوں کی دوکانوں پر ہجوم، آدھی رات تک! دن عید اور رات شبرات آخر کہتے کسے ہیں! عجب نہیں جو یہی چہل پہل دیکھ نواب مرزا شوق غریب شب برات کو شبِ عیش کے معنی میں سمجھ بیٹھے، اور جبھی تو ایک رازو نیاز کے موقع پر یہ مصرع فرما گئے، ؎

سمجھو اس کو شبِ برات کی رات!

غرض دوسری قسم شبِ برات کی یہ ہوئی۔ پہلی کا نام اگر رکھئے شیطانی، تو اس دوسری کو کہئے نفسانی، اور تیسری کے لئے گرہ لگائیے، اسی ردیف وقافیہ میں، روحانی۔

خشک سیدھے سادے لوگ، بڑے کھرّے مسلمان، ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کا دین و شریعت اُن کا ایمان۔ ان بیچاروں کے پاس نہ یہ نہ وہ۔ نہ آتشبازی کی ٹیم ٹام، نہ حلوے توشہ کی دھوم دھام۔ چاند نظر آیا شعبان کا، کہ دھیان بندھ گیا رمضان کا۔ اب ہر وقت روزوں کی فکر و اہتمام، ماہ مبارک ہی کی پیشوائی کا انتظام اور جو ہمت یاوری کر گئی تو اسی مہینہ سے روزے رکھنے شروع کر دئے، کہ ہمارے آقا و سردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور یہی تھا۔ خدمت میں رہنے والے صحابیوں کا بیان ہے کہ روزے تو آپ جب تب رکھا ہی کرتے تھے، لیکن شعبان تو کہنا چاہئے روزوں ہی کی نذر ہو جاتا تھا اور خود اس

سرورِ سردار نے فرمایا بھی تو ہے کہ رمضان میرے اللہ کا مہینہ ہے، اور شعبان خود میرا مہینہ۔ رمضان کا مرتبہ تو ظاہر ہی ہے، لیکن کیا کہنے ہیں اُس مہینے کے بھی، جسے اللہ کے رسول اپنا مہینہ کہہ جائیں!

خیر، یہ سارے مہینے کے روزے رکھ ڈالنا تو ہمت وروں کا کام ہے۔ باقی اتنی ہمت نہ ہوئی، جب بھی مہینہ میں کم از کم ایک روزہ، ۱۵ شعبان کو تو رکھ ہی لیا۔ ۱۴ کا دن ختم ہوا، اور پندرہویں شب آئی کہ مصلّے دعا و عبادات کا بچھا کر بیٹھ گئے، خواہ مسجد میں خواہ گھر میں۔ آج کی رات برکت والی، رحمت والی، مغفرت والی رات ہے، شریعت کی زبان میں لیلۃ البراءت ہے، اور براءت کے معنی نجات کے، قید سے چھوٹنے کے، عذاب سے آزاد ہونے کے ہیں۔ لطف و نوازش کی دولت لٹتی ہر رات کو ہے، آج اور زیادہ لُٹے گی، رحمتوں کا نزول ہوتا ہر رات کو ہے، آج اور زیادہ رہے گا۔ مانگنے والے آج خوب خوب مانگیں گے، پانے والے آج خوب خوب پائیں گے۔ نمازیں پڑھتے تو ہر رات کو تھے، آج اور زیادہ پڑھیں گے۔ نفلوں کی تعداد آج معمول سے بڑھائیں گے۔ رات کے زیادہ سے زیادہ حصے جاگ کر بسر کریں گے، نیند اُڑائیں گے، داستانیں سُن سُن کر نہیں، ناٹک، سوانگ، اوپیرا دیکھ کر نہیں، گلے کی تانوں اور باجے کی الاپوں میں گم ہو ہو کر نہیں، نمازیں پڑھیں گے، قرآن مجید کی تلاوت کریں گے، دعائیں مانگیں گے، اپنے لئے بھی، دوسروں کے لئے بھی، زندوں کے لئے بھی، مُردوں کے لئے بھی۔

عشا کے بعد گشت کو نکل جائیں گے۔ گشت بازاروں کا، تماشا گاہوں کا، سیر و تفریح کی دکانوں کا نہ ہوگا، قبرستانوں کا ہوگا! ہم سب کی

بی بی عائشہ رضی بیان کرتی ہیں کہ پندرہویں تاریخ کی، شب میں میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہوں کہ میرے اور سب کے والی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بستر مبارک سے اُٹھ رہے ہیں آہستہ آہستہ کہ میں جاگ نہ پڑوں۔ اُٹھے آہستہ چلے آہستہ، کواڑ کھول باہر قدم مبارک رکھے آہستہ۔ مجھے حیرانی ہوئی اور بدگمانی بھی کہ کہیں کسی دوسری بیوی صاحبہ کے ہاں کا تو ارادہ نہیں ہے۔ چُپکے سے اُٹھ، دبے پاؤں پیچھے ہولی۔ اب آگے آگے آپ پیچھے پیچھے میں۔ دیکھتی ہوں کہ آپ شہر کے باہر مدینہ کے مشہور قبرستان بقیع میں پہونچے، اور کھڑے ہو کر لگے میتوں کے حق میں دعائیں کرنے، التجائیں کرنے۔

اللہ اللہ! ساری خلقت نیند کے مزے لے رہی ہے، اور ایک یہ اللہ کا بندہ، بے نظیر و بے مثال، اپنا چین چھوڑے، نیند سے منہ موڑے، خالق کے حضور میں کھڑا مصروف ہے دعاؤں میں، مناجاتوں میں!——

اپنے آقا و سردار کے اِسی طریقہ کی پیروی میں سیدھے سادے مسلمان بھی آج رات کو نرم نرم بستروں کو چھوڑ کر، نیند کے مزہ سے منہ موڑ کر، اپنے اپنے گھروں سے باہر نکلیں گے، یار دوستوں کے چہچہوں کے لئے نہیں غفلت کے قہقہوں کے لئے نہیں، عبرت کے آنسوؤں کے لئے، آہوں کے لئے دعاؤں کے لئے! اُس وقت کے سماں کا کیا کہنا! وہ پندرہویں کے پورے چاند کا نکھار، گویا آسمان سے زمین تک بارشِ انوار! وہ قبرستانوں کا سناٹا، وہ دلوں میں عبدیت کا احساس، وہ زندوں کا مُردوں کے حق میں دعائیں کرنا، لجاجت کے ساتھ، مِنّت و سماجت کے ساتھ! منظر اس سے بھی بڑھ کر مؤثر اور کون سا ہوگا۔ تعلق سُننے سے نہیں، دیکھنے سے ہے، اور دیکھنے سے بھی بڑھ کر خود عمل کرنے سے ہے!——بندہ نواز

کی بندہ نوازی جوش میں اب بھی نہ آئے گی تو کب آئے گی؟ مانگنے والے، اب کون بتائے، کیا کیا پاتے ہیں، واپسی میں کیا کیا لاتے ہیں! گھر آئے تو کسی نے برائے نام سحری کھائی اور کسی نے ذری کی ذری کمر سیدھی کرلی۔ فجر میں اب دیر ہی کتنی اور تہجد بھلا آج کیوں ناغہ ہونے لگے!

صبح ہوگئی۔ اور آج دن میں روزہ ہے۔ خبر دی ہے اُس مخبرِ صادق نے جو ہم سب سے کہیں زیادہ علم والا تھا کہ آج آسمانی دنیا پر گویا "سالِ تمام" کا دن ہوتا ہے۔ ہر شخص کا "چِٹھا" کٹ جاتا ہے، اُس کی موت زندگی، بیماری تندرستی، تنگی خوشحالی، غم و شادمانی، سب کا حساب سال بھر کیلئے آج ہی فرشتوں کے رجسٹر میں درج ہوجاتا ہے۔ مبارک ہے وہ بندہ، جس کا نام ایسے وقت رجسٹر میں درج ہو کہ وہ مالک کی چاکری میں کمر بستہ پایا جائے، دن ہو تو روزہ دار، رات ہو تو تہجد گذار۔ خوش نصیب ہے وہ ملّت، جس کا ایک ایک فرد آج اپنے نفس کی اصلاح و احتساب کا سالانہ پروگرام بنائے۔ بدی کی مخالفت کا، نیکی کی متابعت کا بیڑا اُٹھائے۔ رمضان کے فرض روزوں کے بعد پھر جن تاریخوں کے روزہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص اہتمام تھا، انھیں میں سے ایک یہ روزہ پندرہویں شعبان کا ہے۔ بس یہ ہے کل کائنات مذہبی حیثیت سے شبرات کی۔ رتجگا نہ سینما، کارنیوال نہ ڈراما، نوبت، نہ روشن چوکی، آتش بازی، نہ حلوے سازی، ناچ نہ رنگ، نہ شرابیوں جواریوں کے ڈھنگ۔ رات کی عبادت اور دن کا روزہ۔ بس اللہ اللہ خیر صلاح!

(۸) امیر خسروؒ[1]

بزرگ اور درویش کی حیثیت سے

خالق باری کا نام بھی آج کے لڑکوں نے نہ سُنا ہوگا۔ کل کے بوڑھوں کے دل سے کوئی پوچھے! کتاب کی کتاب از بر تھی۔ زیادہ نہیں، پشت ہی دو پشت اُدھر کی بات ہے، کہ کتاب تھی مکتبوں میں چلی ہوئی، گھروں میں پھیلی ہوئی، زبانوں پر چڑھی ہوئی۔ گویا اپنے زمانۂ تصنیف سے صدیوں تک مقبول و زندہ، مشہور و تابندہ! —— دستِ قدرت نے جس کی زبان میں یہ موہنی رکھدی تھی، جس کے کلام کو یہ حُسنِ قبول کی دولت دے دی تھی، اُسی کا نام تھا امیر خسروؒ۔ امیروں میں امیر، فقیروں میں فقیر، عارفوں کا سردار، شاعروں کا تاجدار۔ شعر و ادب کے دیوان اُس کی عظمت کے گواہ۔ خانقاہیں اور سجادے اُس کے مرتبہ سے آگاہ۔

سرِ مشاعرہ آجائیے تو میرِ محفل اُسے پائیے۔ خاندانِ چشت اہلِ بہشت کے کوچہ میں آنکلیے، تو حلقۂ ذکر و فکر میں سرِ مسند جلوہ اُس کا دیکھیے۔ اچھے اچھے شیخ دم اُس کا بھر رہے ہیں۔ معرفت و طریقت کے خرقہ پوش کلمہ اُس کے نام کا پڑھ رہے ہیں!

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن۔ ۱۸ نومبر ۱۹۳۸ء کی شام کو۔ وقت ۱۰ منٹ۔

والدین نے نام ابوالحسن رکھا۔ شہرتِ عام کے نقیبوں نے امیر خسروؒ کہہ کر پکارا۔ سال ولادت ہجری کا چھ سو اکیاون ۶۵۱ھ اور عیسوی کا بارہ سو ترپن ۱۲۵۳ء۔ ترکستان کے علاقۂ بلخ میں کوئی بستی ہزارہ کہلاتی ہے۔ یہ گوہر اُسی کان سے نکلا۔ ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے نام سے موسوم تھا، یہ جوہر اُسی خاندان سے چمکا۔ والدِ بزرگوار کا نام تھا امیر شمس الدین محمود شمسی۔ چنگیز خاں کے زمانہ میں ترک وطن کر، ہندوستان پہونچے۔ یہاں ایک مقام پٹیالی عرف مومن آباد تھا، وہاں آبسے۔ پرانے تذکرہ نویسوں نے دھندلی سی نشان دہی کی ہے کہ شہر کہیں نواح سنبھل یا مضافات دہلی میں تھا۔ نئے جغرافیہ نے نقشہ پر انگلی رکھ کر دکھا دیا کہ ضلع ایٹہ میں ایک قصبہ ہے۔ شادی یہیں ہوئی، بستی کے نامور اور درویش منش رئیس اور ضلع کے منصب دار نواب عماد الملک کی صاحبزادی کے ساتھ۔ یہیں امیر کی پیدائش بھی ہوئی۔

تاریخ خوش اعتقادی کی زبان سے روایت یہ بیان کرتی ہے کہ پڑوس میں کوئی مجذوب رہتے تھے، صاحبِ کشف۔ لوگ خرقہ میں لپیٹ کر بچہ کو اُن کی خدمت میں لائے۔ دیکھتے ہی بولے، یہ کس کو لے کر آئے، یہ تو خاقانی سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر رہے گا! ——— مجذوب صاحب کی نگاہِ کشفی شاعری کی حد تک رہی۔ بچہ نے بڑے ہو کر فقر و درویشی میں وہ مقام حاصل کیا کہ شاعری منہ دیکھتی رہ گئی۔

تعلق عمر بھر کہنا چاہئے کہ سرکار و دربار سے رہا۔ کبھی براہ راست شاہی دربار سے، کبھی اُمرائے نامدار سے۔ اور سرکاریں بھی ایک دو نہیں، خلجی اور تغلق ملا کر سات سات بادشاہوں کی دیکھ ڈالیں پھر شخصی

سلطنتوں کی نیرنگیاں، انقلابات کے طوفان قیامت خیز۔ دیس میں بھی رہے، پردیس بھی گئے۔ بنگال بھی گھومے، اودھ کی بھی سیر کی۔ لیکن دل جہاں اٹکا تھا، وہیں اٹکا رہا۔ نظر جس رُخ پر ایک بار پڑی تھی، اُسی پر جمی رہی۔ ابھی آٹھ ہی برس کے تھے، کہ عقیدت مند باپ نے لاکر سلطان الاولیاء خواجہ نظام الدینؒ کے قدموں پر ڈال دیا۔ سنِ رُشد کو پہونچے تو بیعت کی تجدید کی۔ بیعت رسمی نہ تھی۔ ایک نسبتِ عشقی تھی کہ دونوں طرف سے قائم ہوگئی تھی۔ خواجہ کا مرتبہ دیارِ محبت و معرفت میں اسی سے ظاہر ہے کہ اولیاء کرام نے مقبولینِ انام نے بقائے دوام کے دربار میں محبوب الٰہی کہہ کر پکارا۔ امیر کو دولت ملی محبت کی بھی، محبوبیت کی بھی۔ تذکروں کی روایت ہے کہ جس روز تجدیدِ بیعت کی ہے، سارا ساز و سامان کھڑے کھڑے لٹا دیا ـــــ جو نقد دل نثار کرچکا ہو، اُسے زر و مال لٹا دیتے دیر ہی کیا لگ سکتی ہے؟

کہتے ہیں کہ آج سے پہلے، بہت پہلے، کوئی چھ سات سو برس پہلے، باہر سے آئے ہوئے ایک امیر کبیر مسافر، ایک سرا میں آکر اُترے۔ کنیزیں، خدام، زر و جواہر، بیش قیمت مال و اسباب سب ہی کچھ ساتھ۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں ایک دوسرا مسافر، مفلس و مفلوک الحال، دہلی سے واپس ہوتے ہوئے اسی سرا میں ٹھہرا۔ رئیس کو بوئے اُنس محسوس ہوئی۔ بڑھ کر پوچھا، کدھر سے آنا ہوا؟ جواب ملا دہلی سے۔ پوچھنے والا کا اشتیاق دہلی کا نام سُن کر تیز ہوا۔ پوچھا اُس شہر میں ایک درویش خواجہ نظام الدین ہیں، وہاں بھی حاضری کا اتفاق ہوا تھا؟۔

مفلس بولا "اتفاق کیسا، اُنھیں کے پاس تو گیا تھا۔ حاجت مند ہوں، چاہتا تھا کہ کچھ مل جائے۔ میری قسمت کہ وہاں کچھ موجود ہی نہ تھا۔ پیر کی پہنی ہوئی جوتیاں پڑی تھیں، وہی میرے حوالہ کر دیں، اُنھیں کو لئے چلا آرہا ہوں۔" سُننے والا اب شوق و اشتیاق سے بیخود تھا۔ بولا "خدا کے لئے وہ جوتیاں میرے حوالے کر دو، اور یہ میرا سارا ساز و سامان سب تمہاری نذر ہے۔" سائل دنگ و حیران کہ جوتیوں کے عوض یہ لاکھوں کی دولت؟ رئیس صاحب کہیں مجھ بے نوا سے دل لگی تو نہیں کر رہے ہیں۔ ادھر رئیس صاحب اپنے ہوش میں تھے کب، اور ہنسی دل لگی کی سکت ہی اُن میں کہاں تھی؟ راوی کہتے ہیں کہ یہ سودا چار پانچ لاکھ میں پڑا، اور رئیس صاحب نے وہ پیر کی اُتری جوتیاں آنکھوں سے لگا، سر پہ رکھ، پگڑی کے اندر لپیٹ لیں، اور ایک وجد کے عالم میں دہلی چل کھڑے ہوئے! ــــ جوتیاں جس محبوب کی تھیں، وہ تو وہی ہیں جنھیں زبانِ خلق محبوبِ الٰہیؒ کے نام سے پکارتی ہے، اور امیر وہی امیر خسرو تھے جن کا یہ فارسی شعر اُس وقت تک سے اب تک خدا معلوم کتنے دلوں کو، حال و قال کی محفلوں کو گرما چکا ہے۔ ع

متاعِ وصلِ جاناں بس گران ست

گر ایں سودا بجاں بودے چہ بودے

یہ رقم تو خیر لاکھوں ہی کی تھی، کہنے والا تو یہ کہہ رہا ہے کہ محبوب تک رسائی اگر نقدِ جاں کے معاوضہ میں ہو جائے تو بھی یہ سودا نہایت ارزاں ہے!

ــــــــــ

آگے چلیے۔ دنیا کی عمر چند سال اور کھسکی خلجی و تغلق کی بہار رخصت ہوئی دہلی کے تخت پر اب آل تیمور کا اقبال چمک رہا ہے۔ سخن سنج و سخن گستر بادشاہ کے حضور میں محفلِ سماع گرم ہے۔ جب مطرب اس شعر پر پہونچا۔

تو شبانہ می نمائی، بہ بر کہ بودی اِمشب
کہ ہنوز چشم مستت اثرِ خمار دارد

بادشاہ کا ذہن قدرتاً شعر کے ظاہری مفہوم کی طرف گیا، اور قریب تھا کہ شاعر کی بیحیائی کا خمیازہ قوّال غریب کو عتابِ سلطانی کی شکل میں اُٹھانا پڑے، کہ ایک مزاج داں وادب شناس ندیم نے جھٹ ہاتھ باندھ عرض کی کہ "پیرو مرشد! غزل خسرو کی ہے، تصویر کھینچ رہے ہیں اپنے تہجّد گزار، شب بیدار، محبوب، محبوب الٰہی کی، کہ ساری رات کن کن اذکار، کن کن اشغال میں گزاری، کون کون سے احوال و مقامات طے کئے، کہ جاگنے کا اثر اس وقت تک دن میں باقی ہے!" معاً عتاب لطف میں، اور ناگواری واہ میں تبدیل ہو کر رہی۔

وقت کی محدود گنجائش کے ماتحت صرف ایک شعر نمونہ کے طور پر پیش کر دیا گیا، ورنہ غزلوں کی غزلیں نہیں، دیوان کے دیوان بریز ہیں انھیں مواجید و احوال کی تلمیح سے، رموز و اسرار عارفین کی توضیح سے۔ ہندی کے دوہے اور ٹھمریاں، ایک دو کی تعداد میں نہیں، بیچاسوں اور سیکڑوں، سب میں یہی نقشہ جما ہوا، یہی رنگ بھرا ہوا۔ حد یہ ہے کہ مرشد خود فرمایا کرتے تھے کہ خدا قیامت میں پوچھے گا، کیا لائے ہو؟ جواب میں عرض کروں گا کہ خسروؒ کو۔ گریہ و مناجات میں ہوتے تو عرض

کرتے کہ الٰہی میری مغفرت اِسی ترک کے سوزِ دل کے طفیل کر دے!
___ بڑوں کا اور مرشد کا وسیلہ پکڑتے ہوئے سب نے دیکھا ہے، چھوٹوں کے اور مریدوں کے وسیلہ بننے کی مثال حضرت امیر خسروؒ کے نصیب میں آئی۔

سوزِ دل اور ذوقِ عبادت کا عالم یہ تھا کہ پچھلی رات نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو سات سات پارے قرآن مجید کے پڑھ جاتے۔ جبتک دل ایسا ہی درد و خشیت سے چور چور نہ ہو، اتنا بڑا مجاہدہ کس کے بس کی بات؟ اودھ میں ایک بڑے رئیس کے دربار میں تھے، ماں نے دلّی میں یاد کیا۔ معقول مشاہرہ پر لات مار ماں کے پاس پہونچے۔ ماں کی وفات پر پُر درد مرثیہ لکھا۔ بہ قول مولانا شبلی، اڑتالیس سال کی عمر میں ماں کی یاد میں اس طرح آنسو بہاتے ہیں، کہ گویا کوئی کمسن بچہ بلک بلک کر رو رہا ہے۔ یہ سب پرتو ہے اُسی سوز و گداز کا، جس کا واسطہ دلا دلا کر خود مرشد علیہ الرحمہ اپنی نجات کے طالب رہتے تھے!
۷۲۵ھ کا ماہ ربیع الثانی تھا کہ حضرت محبوب الٰہی جنّت کو سدھارے۔ امیر اس وقت بنگالہ میں تھے۔ خبر وحشت اثر سُنی تو بھاگا بھاگ دلّی پہونچے۔ مزار پر حاضر ہوئے تو اہل ارادت کی روایت ہے کہ ہندی کا یہ شعر اسی وقت پڑھا ؎

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چودیس

ماتمی لباس پہن لیا، سب کچھ لٹا دیا، خالی ہاتھ ہو بیٹھے، غم کی آگ

میں جلتے، ہجر کی بھٹی میں تپتے، خود اپنے وقت کا انتظار کرنے لگے۔ اِدھر چھ مہینے کی مدت پوری ہوئی، کہ اُدھر ۱۸ر شوال ۷۲۵ھ (مطابق ۱۳۲۵ء) کو خود بھی اپنے محبوب سے جا ملے ـــــــ حضرت فاطمہ زہرا رضی بھی مرشدِ کائنات کا غم اس سے زیادہ کب برداشت کر سکی تھیں ـــــــ تجویز پیش ہوئی کہ دفن مرشد ہی کی تربت میں کیے جائیں۔ احترام شریعت غالب آیا۔ پائنتی کی جانب چند گز ہٹ کر قبر بنی۔ اہلِ دل اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ آستانۂ سلطان المشائخ سے پہلے اگر اس کشتۂ عشق و محبت اور مجسمۂ سوز و گداز کے مرقد پر فاتحہ خوانی کر لی جائے تو دل کی انگیٹھی کی چنگاریاں اور تیز و روشن ہو جاتی ہیں۔

ـــــــ ❊ ـــــــ
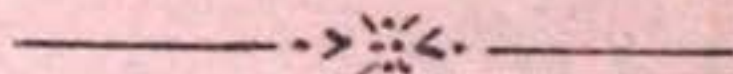
(۹) عید الاضحیٰ

لبیک اللّٰھم لبیک، لبیک لاشریک لک لبیک! حاضر ہے اے میرے آقا اور مولا، آپ کا یہ بندہ، حاضر ہے، یہ گواہی دیتا ہوا کہ آپ ہر طرح کی شرکت سے ماورا اور برتر ہیں۔

روحانیت کی دنیا میں بہار کا موسم آگیا۔ کعبہ اسلام کا جغرافیائی مرکز ہے۔ اس کے جشن کا دن آگیا۔ دور دور سے، پورب سے اور پچھم سے، اُتر سے اور دکھن سے، کھنچ کھنچ کر قافلہ پر قافلے چلے آرہے ہیں۔ بوڑھے بھی، جوان بھی، لاغر بھی اور پہلوان بھی، گورے بھی، کالے بھی، عالم، فاضل، کامل بھی، نادان، ان پڑھ، جاہل بھی، پیدل اور سواریوں پر اونٹوں اور موٹروں اور لاریوں پر۔ اسلامی قمری سال کے بارہویں مہینے، ذالحجہ یا بقرعید کا پہلا ہفتہ آیا کہ ہزاروں، بلکہ کبھی تو لاکھوں کا جماؤ ہوگیا مکہ کی گلیوں میں حرم شریف کے لق ودق صحن اور بڑے بڑے دالانوں میں۔ لبیک لبیک کی صدائیں ہر طرف بلند، ہر بلندی پر چڑھتے ہوئے، ہر پستی میں اُترتے ہوئے، سواری پر سوار ہوتے ہوئے، مسجد کا رُخ کرتے ہوئے،

ہر طرف یہی ذکر، یہی فکر۔ احرام کی چادریں شانوں پر، توحید کے نعرے زبانوں پر۔ ۸ر تاریخ سے لے کر ۱۳ر تک، مکہ کی گلیوں، عرفات اور مزدلفہ میں حاجیوں کا ہجوم، تکبیر و تہلیل، طواف و قربانی کی دھوم، زائروں کا اژدہام، ابھی کوچ ابھی مقام۔ صفا و مروہ کے درمیان لپکتے جاتے ہیں، دوڑتے جاتے ہیں، عرفات کے چٹیل میدانوں میں اپنے گناہوں کو یاد کرتے جاتے ہیں، گڑگڑاتے جاتے ہیں۔ کعبہ کے گرد گھوم رہے ہیں، چکر پر چکر لگا رہے ہیں، منیٰ میں قربانیاں کر رہے ہیں، شیطان کے مجسموں پر کنکریاں برسا رہے ہیں، توحید کا کلمہ ہر حال میں پڑھتے ہوئے، رب کا نام ہر آن جپتے ہوئے —— یہ احکام ہوئے مرکز تک پہونچ جانے والے خوش نصیبوں کے۔

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ و اللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد۔ بڑائی آپ میں ہے، صرف آپ میں ہے، کوئی آپ کے سوا معبود نہیں، کوئی آپ کے سوا مقصود نہیں۔ بڑے صرف آپ ہیں، صرف آپ ہیں۔ کمالات ہر قسم کے جمع ہیں صرف آپ کی ذات میں، آپ کی صفات میں۔ ۹ر تاریخ کی فجر کی نماز سے یہ تسبیح شروع ہوگئی، اور جاری رہے گی۔ اس کی گونج ہر فرض نماز کے بعد، ۱۳ر کی عصر تک، گویا ۲۳ نمازوں کے ساتھ۔ اور دسویں تاریخ کی صبح کو سب چھوٹے بڑے مل کر عید کی نماز پڑھیں گے، شہر سے باہر عید گاہ میں، اور اس نماز میں بھی ہر مرتبہ سے کئی کئی بار زائد تکبیر کہیں گے۔ جسم کی صفائی کے ساتھ، لباس کی ستھرائی کے ساتھ نماز پڑھنے جائیں گے۔ امیر و غریب، آقا و خادم، ایک دوسرے کو گلے لگائیں گے۔ روح کی بالیدگی کے ساتھ، قلب کی پاکیزگی کے ساتھ واپس آئیں گے۔

اللہ کا نام پکارتے جائیں گے، توحید کی منادی کرتے آئیں گے۔ یہ کون بتائے کیا کیا مانگیں گے کیا کیا پائیں گے، کیسی کیسی دولت اپنے ساتھ لائیں گے۔ پیسہ والے قربانیاں کریں گے، اور زبان کی لذّتوں میں، خوان کی نعمتوں میں، اپنے سے بھی بیشتر۔ مفلسوں، غریبوں، عزیزوں، قریبوں کا حصہ نکال رکھیں گے ـــــ یہ آداب ہوئے مرکز سے دور، عالمِ اسلام کے گوشہ گوشہ میں رہنے والوں، بسنے والوں کے! آج جشن ہے کعبہ کا، دین توحید کے مادی مرکز کا۔ اس میں شرکت سے محروم نہ پاس والے رہیں نہ دور والے۔

کہتے ہیں کہ آج سے قبل، بہت قبل، جہاں آج ملکِ عراق ہے، وہاں ایک ملک آباد تھا کالڈیا یا کلدانیہ نام۔ اپنے وقت میں مہذّب اور متمدّن۔ اُس کے مہذّب ترین اور متمدّن ترین شہر اور پایۂ تخت کا نام تھا اُر۔ اُس کا پورا پتہ آج کے نقشہ میں چلانا ہو تو عالمِ خیال میں خلیج فارس سے بغداد کی طرف چلیے۔ آپ چلے۔ لیجیے اب آدھا فاصلہ طے کر چکے۔ اب دریائے فرات آپ کے بائیں ہاتھ پر ہے، کوئی دس میل کے فاصلہ پر کہ آپ اُر کے کھنڈروں میں پہونچ گئے۔ یہیں ایک شریف اور معزز گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ نام ابراہیم رکھا گیا، یا حسب روایت توریت پہلے ابرام اور بعد کو ابراہام۔ سالِ پیدائش آرکیالوجی (اثریات) کے مشہور ماہر سر چارلس مارسٹن کی تحقیق کے مطابق ۲۱۶۰ء قبل مسیح تھا یعنی آج سے ٹھیک چار ہزار ایک سو سال قبل۔

فنونِ لطیفہ میں نقّاشی، سنگتراشی جو درجہ آج رکھتے ہیں، وہی اُس وقت

بھی حاصل تھا، کہ یہ فنون تو لوازم تمدن میں سے ہیں۔ مذہب شرک تھا پرانی اصطلاح میں یا خداؤں کا تعدد حال کے بول چال میں۔ اثریاتِ عراق کے ایک اور ماہر سر لیونارڈ ددلی کا بیان ہے کہ "اُور کا مذہب جلی ترین شرک تھا" جن دیوتاؤں کے نام ہم تک پہونچے ہیں، اُنھیں کی تعداد پانچ ہزار ہے!

سنگ تراشی کو بت تراشی میں تبدیل ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ بچہ کے والد کا نام توریت میں آیا ہے تارح اور قرآن میں آذر۔ خود ایک بڑے آرٹسٹ (صنّاع) تھے۔ اور خاص آرٹ یا صنعت سنگ تراشی اور بُت گری تھی۔ پتھر کی مورتیں اس کاری گری، اس ہنر مندی سے بناتے کہ دیکھنے والے واہ واہ کرنے لگتے۔ بچّہ کی فطرت سلیم تھی جسم کی آنکھ نے یہ منظر دیکھا، تو بغاوت کی ٹھان لی۔ روح کی آنکھ نے توحید کی جھلک دکھادی۔ ضمیر کی آسمانی قوت نے، غیب کا اشارہ پا، زبردست روحانی انقلاب کی ٹھہرالی۔ اُٹھے، بڑھے، بولے۔ پہلے ہنسے گئے، پھر ستائے گئے، ہٹائے گئے، مٹائے گئے۔ وطن چھوڑا، رُخ مغرب کی جانب کیا۔ شام پہونچے، فلسطین کی وادیاں طے کیں۔ مصر کی سرزمین چھانی۔ قدم اُس ملک میں رکھا جو خشک تھا، اور ایک ریگستانِ بے آب وگیاہ! آسمانی روشنی کی ایک تڑپ نے نشاندہی کی کہ یہی تو وہ زمین ہے، جس کے لئے ازل سے رشکِ آسماں ہونا، کائناتِ انسانی کا روحانی مرکز بنا طے ہوچکا ہے۔ سیاحی کے قدم رُک گئے، مسافرت نے وطن گزینی کی شان پیدا کرلی۔ مصری بیوی شاہزادی تھیں۔ اُن سے صاحبزادہ تولد ہوئے۔ نام اسمٰعیل رکھا گیا۔ پرورش لاڈ سے، پیار سے ہوئی۔ پلے، بڑھے،

بڑے ہوئے، باپ کے ہاتھ بٹانے، ماں باپ کے کام آنے لگے۔ اِدھر زمین پر یہ ہو رہا تھا۔ اُدھر باپ کو خواب میں حکم آسمان والے کا ملا کہ بیٹے کو ہماری راہ میں قربان کر دو۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسانی قربانی کا دستور اُس وقت عام تھا۔ دیویوں اور دیوتاؤں کے استھانوں پر انسانوں کی بھینٹ آئے دن چڑھتی رہتی تھی۔ لیکن بیٹے اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کس باپ نے کی تھی؟ فرمائش کس باپ سے ہوئی تھی؟ ابراہیم مرحلے عشق و محبت کے بہت سے طے کئے ہوئے اور کڑیاں عبدیت اور عبودیت کی بہت سی جھیلے ہوئے، امتحان کامیابی کے ساتھ بہت سے دئے ہوئے تھے۔ پر یہ آزمائش سب سے بڑی، سب سے کڑی تھی ——— ایسا امتحان تو صرف ایک موحّد ہی کا ہو سکتا تھا۔ یہ ہمت، یہ جیوٹ، یہ حوصلہ صرف ایک موحّد ہی کر سکتا تھا! اللہ اللہ! قیامت کی تھی وہ گھڑی، جب بوڑھے یا اُس وقت کے اوسط عمر کے حساب سے ادھیڑ عمر کے باپ نے اکلوتے نورِ نظر کو، نوجوان، سبزہ آغاز لختِ جگر کو زمین پر لٹایا، اپنی آنکھ پر پٹی باندھی اور چھُری چلا دی۔ ابراہیم نے بڑے دعوے کا اعلان کیا تھا، کہا تھا اور جب کائنات کی ساری فضا مشرکانہ تھی اُس وقت کہا تھا کہ میں موحّد ہوں، مسلم ہوں، میں اپنا سب کچھ سونپ چکا ہوں اپنے مالک و مولا کو۔ اپنے کو فنا کر چکا ہوں، میرا اپنا کچھ بھی نہیں، نہ جان اپنی، نہ اولاد اپنی، سب کچھ اُسی پاک بے نیاز کی ہے۔ امتحان اِسی دعوے کا تھا!

چھُری چلی۔ لیکن اسمٰعیل کے حلقوم پر نہیں، ایک دُنبہ کے گلے پر۔ امتحان عاشقِ صادق کا، بندۂ مسلم و فرمانبردار کا ہو چکا تھا۔ ایک دُنبہ غیب سے لا کر اسمٰعیل کی جگہ پر رکھ دیا گیا تھا۔ بشارت ملی کہ تمھاری

قربانی قبول ہو گئی ۔ اس مقبولیت کی یادگار دنیا میں مستقل اور پائیدار کر دی جائے گی ۔

جشن آج کعبہ کا ہو رہا ہے ۔ یہ ہفتہ ہفتۂ کعبہ منایا جا رہا ہے ۔ کیسے ممکن تھا کہ یاد تعمیر کعبہ کی دلائی جاتی اور معمار کعبہ کو بھلا دیا جاتا! ابراہیم توریت اور قرآن دونوں کی زبان میں اللہ کے دوست اور خلیل، وہ تھے کہ انھوں نے اور اُن کے انھیں جگر گوشہ اسمٰعیل نے مل کر کعبہ کی دیواریں بنائی تھیں، بنیادیں اُٹھائی تھیں، پتھروں کی ڈھلائی کی تھی، جڑائی کی تھی ۔ عمارت جب تک زندہ ہے، معمار بھی مردہ نہ ہونے پائے گا، نہ اُس کا کام نہ اُس کا نام ۔ روایتوں میں آتا ہے کہ واقعۂ قربانی کے وقت حضرت اسمٰعیل کی عمر ۱۳ سال کی تھی، اور یہ تصریح توریت میں موجود ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیم کا سِن ۸۶ سال کا تھا ۔ یہ دونوں حساب اگر صحیح ہیں تو سنہ ۲۱۶۰ع سے ۹۹ سال گھٹا دیجئے ۔ اور واقعۂ قربانی کی تاریخ آکر سنہ ۲۰۶۱ع ٹھہرتی ہے، یعنی آج سے چار ہزار ایک سو سال قبل!

وہ دن ہے اور آج، کہ اِدھر سال کی وہ قمری تاریخ آئی، اور ادھر ملت ابراہیمی کا نام لیوا مسلمان روئے زمین کے جس حصہ پر بھی آباد ہوا، قربانی کے جانور کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا ۔ جانور اچھے سے اچھا ڈھونڈ کر لائے گا ۔ جانور حرام نہ ہو، گندہ نہ ہو، اندھا، لولا، لنگڑا نہ ہو ۔ حلال ہو، پاکیزہ ہو، تندرست بھلا چنگا ہو ۔ جانوروں میں بھی شرافت کا ایک معیار ہوتا ہے ۔ شریعت نے شرافتِ خاندانی صرف چند جانوروں کی معتبر مانی ہے، اور وہ معروف و معلوم ہیں ۔ اُن میں سب سے بڑا جانور اونٹ اور

سب سے چھوٹا بکری۔ مسلمان انھیں اچھے داموں، اپنی حلال، پاکیزہ کمائی سے خرید کر لائے گا۔ کھلائے گا، پلائے گا، اپنے سے ہلائے گا، اور جب وقت آجائے گا، تو بیدردی اور خشونت سے نہیں، عبدیت اور عبودیت کے جذبہ سے مغلوب ہوکر، اپنے اور اُس کے دونوں کے خالق و مالک کو یاد کرکے، یہ کہتے ہوئے اُسے زمین پر قبلہ رو لِٹائے گا، کہ اے ہمارے مالک و مولا قبول کر ہماری قربانی جس طرح تو نے قبول کی قربانی اپنے خلیل ابراہیم کی ——— مبارک وہ انسان جو دور کا، بہت دور کا بھی، تشبّہ پیدا کرسکے، ابراہیم خلیل سے۔ مبارک تر ہے وہ قربانی کا جانور جو برائے نام سہی، کوئی نسبت تو قائم کرسکے اللہ کے ذبیح اسمٰعیل سے!

گلے پر چھری پھیرتا جائے گا، اور کہتا جائے گا، انی وجہت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔ میری ساری توجہ کا مرکز، میری ساری عبودیت کا قبلہ تو اے قبلۂ حاجات صرف آپ ہیں! زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے! مجھے اور کسی سے غرض کیا؟ میں اپنا رشتہ تو سب سے توڑے ہوئے ہوں، صرف آپ سے جوڑے ہوئے ہوں ——— اس وقت بھی نیت صرف آپ سے تقرب کی ہے، تعمیل آپ ہی کے حکم کی ہے! ——— عیدِ قرباں یادگار ہے دنیا کے اوّل المسلمین کی ایک قدیم ترین موحّد کے ایثار کی حق ہے کہ توحید ہی کا رنگ جھلکے اُس کی ایک ایک شان سے، اس کی ہر ہر آن سے۔ اسلام کی جنتری میں جشن صرف دو ہیں، عید اور بقر عید۔ اور دونوں کا مقصد ہے امّت کی مرکزیت اور شیرازہ بندی۔ ایک، یادگار ہے نزول قرآن کی۔ دوسری، یاد دلاتی ہے کعبہ کی تعمیر کو، کعبہ کے معمار کو!

---

(۱۰) محمد علیؒ کے خطوط[1]

نوجوانی سے اپنے قبل از وقت بڑھاپے تک محمد علی یورپ سمندر پار چھ بار گئے اور خطوط ہر دفعہ وہاں سے بہت سے لکھے۔ لیکن شروع میں ان خطوط کو کون محفوظ رکھتا؟ اُس وقت کسے خبر تھی کہ گودوں کا کھلایا ہوا لڑکا، ساتھ کا کھیلا ہوا نوجوان ایک روز شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے گا؟ آخر کے خطوط بے شک بہت سے ہوں گے اور بہت سے لوگوں کے پاس۔ لیکن وہ زیادہ تر اختلافی اور نزاعی مسئلوں سے لبریز، انھیں ریڈیو پر کوئی کیسے لائے؟ خاص و عام کو کیسے سنائے؟ اس ذخیرہ کے علاوہ اور بھی جتنے ہیں اتنے زائد ہیں کہ کوئی اُنھیں پھیلانے پر آئے تو آج کا سارا پروگرام اسی ایک عنوان کی نذر ہو جائے۔ داستان گو تھک جائے اور داستان ختم نہ ہونے پائے۔

محمد علی مولانا تو بہت بعد کو ہوئے۔ شروع میں مدتوں مسٹر رہے، مسٹر ہی کہلائے پہلا سفر ۱۸۹۶ء میں کیا، جب پرانی صدی کے ختم ہونے کے دو سال رہ گئے

---

[1] دہلی ریڈیو اسٹیشن سے۔ اپریل ۱۹۴۱ء۔ وقت: ۱۵ منٹ: بہ سلسلہ "خطِ سمندر پار سے"۔

تھے۔ سن اس وقت بیسؔ سال کا تھا۔ دوسرا سفر ۱۹۰۲ء میں کیا۔ جب نئی صدی کو شروع ہوئے بھی دو ہی سال ہوئے تھے۔ سن اس وقت ۲۴ سال کا تھا۔ دونوں سفر طالب علمی ہی کے سلسلے میں تھے زیادہ تر آکسفرڈ اور لندن میں۔ مشغلے اسی سن و سال کے لائق اور مراسلے انھیں مشغلوں کے مناسب حال۔ انگریزی میں لکھے ہوئے بڑے بڑے طویل مراسلے علی گڑھ منتھلی میں OX FORD DIDLING کے عنوان سے کئی کئی نمبروں میں نکلتے رہے۔ ذکر زیادہ تر ان میں ہوتا کالج کے کھیل کود کا، ہمجولیوں کی رنگ رلیوں کا اور سب سے بڑھ کر کشتی رانی یا کشتی بانی کا۔ اس دور سے یقیناً آپ کو کچھ زیادہ دلچسپی نہ ہوگی۔

تیسری بار انگلستان جانا ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ اب محمد علی ملک کے ممتاز جرنلسٹ اور انگریزی کے مشہور انشا پرداز تھے۔ کامریڈ عرصہ سے نکل رہا تھا اور اب ہمدرد بھی نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ کانپور کی ایک نئی نکلنے والی سڑک کی زد میں ایک مسجد کا گوشہ آرہا تھا۔ اس پر قدرتاً ایک سخت ہیجان برپا ہو گیا تھا اور معاملہ شہر بلکہ صوبہ کے حدود سے نکل کر "آل انڈیا" بن چکا تھا۔ محمد علی مسلم لیگ کے سکریٹری کو ساتھ لے چپ چپاتے ولایت روانہ ہو گئے کہ وہاں جا کر اس معاملہ اور ایک یہی کیا ملک کے بہت سے معاملات پر لوگوں سے ملیں ملائیں، دلوں کو گرمائیں۔ طبیعتوں کو نرمائیں۔ تقریر سے، تحریر سے، قلم سے زبان سے۔ غرض وہاں پہنچ کر ہندوستان بہت سے خط لکھے۔ عموماً انگریزی میں۔ اکثر کامریڈ میں چھپ بھی گئے۔ اُنھیں پڑھ کر نقشہ نظر کے سامنے پھر جاتا ہے اُس وقت کے ہندوستان کا اس وقت کے ہندی مسلمان کا، اس وقت کے انگلستان کی شان و شوکت کا۔ ناکامیاں قدم قدم پر پیش آتی رہیں۔ ہمت پست نہ ہوئی۔ دعوتیں اور ضیافتیں محمد علی

کی بکثرت ہوئیں۔ لندن میں بھی، ایڈنبرا میں بھی اور نیوکاسل میں بھی۔ ان جلسوں اور صحبتوں میں شریک انگلستان کے چوٹی کے مشاہیر بہت سے ہوئے مثلاً اہل قلم و اہل صحافت میں ایچ جی ویلز، جی کے چسٹرٹن، اے جی گارڈنر، سی پی اسکاٹ، جے اے اسپنڈر، ویلنٹائن ولیمس اور آئرلینڈ کے مشہور شاعر ڈبلو، بی، ایٹس۔ اہل سیاست میں ریمزے میکڈانلڈ، کیر ہارڈی، جان ڈلن، آبرے ہربرٹ، ڈاکٹر درفرڈ، مسٹر نیونسن وغیرہم۔ کچھ ایسے مشاہیر بھی تھے جو عین وقت پر خود آنے سے معذور ہو گئے اور اپنے بجائے اپنے معذرت نامے بھیج دئے مثلاً برنارڈ شا، مسٹر بلنٹ وغیرہم۔ محمد علی ان جلسوں سے خوب کام نکالتے، جو کچھ کہنا ہوتا انھیں موقعوں پر کہہ ڈالتے، طویل مراسلے اُن کے ٹائمز میں تو بار نہ پاتے البتہ دوسرے مشہور اخباروں میں ان کے بیانات نکلتے رہتے۔ لارڈ ہیڈلے اسی زمانہ میں نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور لیڈی ایولین کوبولڈ تو ان سے قبل ہی اسلام قبول کر چکی تھیں۔ ان راستوں سے بھی محمد علی نے انگلستان کی سوسائٹی کے اندر اپنی جگہ پیدا کر لی اور اپنے مشن میں کچھ ایسے زیادہ ناکام نہ رہے۔

۱۶ دسمبر ۱۹۱۳ء کے کامریڈ میں جو مراسلہ نکلا ہے اس میں اپنے اس سفر پر گویا تبصرہ کرتے ہیں "۲۷ نومبر کو ہم لوگ خود ایک الوداعی لنچ اپنے دوستوں اور ہمدردوں کو دے رہے ہیں اس لنچ کی حیثیت سیاسی اور مذہبی نہ ہوگی بلکہ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ ہم ہندوستان اور انگلستان، اسلام اور مسیحیت کے درمیان سفارت کا کام دے سکیں اور تاکہ ہم اپنے مخاطب انگریزوں اور انگریزنوں دونوں کو بتا دیں کہ وہ ہمارے ملک اور مذہب سے ایسے بے تعلق تو نہ رہیں جیسے کہ اب تک رہ چکے ہیں بلکہ ہمارے عزم اور

مقصد اور گلے شکوے خود ہماری زبان سے سُن لیں۔ مشہور افسانہ نگار ایچ جی ویلز سے ملاقات ہو ہی چکی ہے بلکہ اب کی جمعہ کو تو ان میاں بیوی نے اپنے ہاں رات کے کھانے پر مدعو کر دیا ہے۔ اور وقت بھی میری خاطر سے سوا آٹھ کا رکھا ہے کہ میں اس وقت تک ہندوستان کی ڈاک سے فارغ ہو لوں۔" آگے چل کر لکھتے ہیں کہ" ہندوستان اور اسلام کے معاملے میں ان لوگوں کی بے خبری اور جمود دور کرنے کے لئے اور انھیں بار بار چونکاتے رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے ہم خیال لوگ ہندوستان سے بار بار آتے اور یہاں کی رائے عامہ کو برابر تیار کرتے رہیں۔ میں بحیثیت مجموعی مایوس نہیں ہوں۔"

محمد علی اب ملک و ملّت یعنی ہندوستان اور اسلام دونوں کے سفیر تھے اور یہ دوہرا نقطۂ نظر قائم ہو چکا تھا۔ چوتھا سفر انگلستان اور فرانس کا ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے صدر کی حیثیت سے کیا اب ان کا شمار ملک کے مسلّم لیڈروں میں تھا اور مسلمانوں میں تو وہ مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل تھی کہ باید و شاید۔ اب ان کی حیثیت سفیر سے زیادہ مجاہد کی تھی۔ انگلستان خصوصاً شہر لندن میں بہت سی تقریریں کیں۔ اسیکس ہال، کیکسٹن ہال وغیرہ میں اور کچھ فرانس میں بھی۔ موضوع تقریر اسلام اور ہندوستان دونوں کی ترجمانی اور پُر جوش ترجمانی ہی رہتا تھا۔ تقریروں اور پبلک تحریروں کے انہماک میں ہندوستان خطوط لکھنے کا وقت کہاں سے نکالتے۔ اور جو کچھ لکھے بھی ہیں ان کی اشاعت کی نوبت اور بھی کم آئی۔ کوئی اخبار اس وقت ان کے اپنے ہاتھ میں تھا نہیں۔ نہ اردو کا نہ انگریزی کا۔

پانچویں بار بیمار اور زار و نزار ایک قدردان و جوہر شناس ہندو رئیس کے خرچ پر ۱۹۲۶ء میں اپنے علاج کے لئے یورپ روانہ ہوئے۔ ذیابیطس کا علاج فاقوں کے ذریعہ سے کرنا تھا اور اس طریق علاج کے ماہرین فرانس میں تھے اس لئے قدرتاً آپ کی زیادہ تر قیام فرانس ہی میں رہا اور ڈاکٹروں کی شدید تاکید پر سیاسیات وغیرہ سے ایک بڑی حد تک الگ تھلگ رہنا پڑا۔ اس سفر میں راستہ سے جو مفصل خط لکھا قابل ملاحظہ ہے۔ اقتباس ذرا طویل تو ضرور ہوگا لیکن اس سے ایک طرف تو اس سفر اور چوتھے سفر دونوں کے مقاصد روشنی میں آجائیں گے اور دوسری طرف مولانا کا مجلسی اور معاشری نقطہ نظر بھی کسی قدر واضح ہو جائے گا۔ خط ولایتی جہاز "میسی ڈونیا" سے لکھا گیا ہے۔ تاریخ ۶ / جون ۲۸ء کی پڑی ہے اور اب جامعہ والوں نے خطوط محمد علی کے مجموعہ میں چھاپ بھی دیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

"چوتھا سفر ۱۹۲۰ء میں کیا گیا اور ایک آخری کوشش اس کی کی گئی تھی کہ خلافت عظمیٰ کو برقرار رکھا جائے۔ ترکی سلطنت اور اس کے اقتدار کی حفاظت کی جائے...... گذشتہ تجربوں کی بنا پر جانتے تھے کہ کیا حشر ہوگا مگر ع

رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

اس خیال سے احرام سفر باندھا گیا تھا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا بھی کیا حشر ہوا۔ اس سفر کے بعد توبہ کر لی تھی کہ اب آستان بوسی نہ کریں گے۔ اگر پھر جائیں گے تو اسی لئے کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان معاہدہ پر دستخط کریں گے۔ افسوس وہ معاہدہ آج بھی دور نظر آتا ہے مگر الحمد للہ کہ توبہ آج بھی نہیں ٹوٹی...... آج مسٹر واٹسن پولٹیکل سکریٹری گورنمنٹ آف

انڈیا سے جہاز پر ملاقات ہوئی تو ان کی اس غلط فہمی کو بھی دور کر دیا کہ بٹلر کمیٹی[1] کے سلسلہ میں انگلستان جا رہا ہوں۔ محض اپنی صحت کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہوں اور اس پر ہنسی آتی ہے کہ ایک فاقہ کش ملک سے متمول ملک کی طرف ایک فاقہ مست بصرفِ کثیر اس لئے سفر کر رہا ہے کہ وہاں جا کر فاقہ کر کے اپنا علاج کرائے۔

ہندوستانی عورتیں اس جہاز پر بھی ہندوستانی لباس میں سفر کر رہی ہیں لیکن سوائے اینی بیسنٹ کے اخبار نیو انڈیا[2] کے ایڈیٹوریل اسٹاف کے ایک رکن کے جو اچکن اور آڑا پاجامہ پہنے ہوئے ہیں مردوں میں صرف میں ہی ایشیائی لباس میں ملبوس ہوں، آج صبح سے تموّج میں بہت کمی ہوگئی ہے اور آج شب کو ½ ۸ بجے سے جب سے یہ خط شروع کیا گیا ہے جہاز پر مردوں اور عورتوں کا ناچ ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ ڈیک پر میرے قریب ہی ایک خوش رو، وجیہ اور بلند قامت فوجی افسر لیٹے رہا کرتے تھے اور کبھی کبھی ایک دو لفظ بول لیا کرتے تھے۔ آج ایک بچی سے میری دیر تک گفتگو رہی جس میں زیادہ تر میری بچیوں کے نام اور ان کی عمر وغیرہ کے متعلق اس کے سوالات اور میرے جوابات تھے۔ بظاہر اسے سن کر اور کچھ دلچسپ پا کر ان صاحب نے مجھ سے گفتگو شروع کی اور دو گھنٹے تک نہایت آزادی اور صفائی سے مگر پرلطف طریقہ پر سیاسی گفتگو رہی جس کے بعد انھوں نے شکریہ بھی ادا کیا اور داد بھی دی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ بریگیڈیر جنرل ہیں۔"

---

[1] ایک سرکاری کمیٹی، اس کے سامنے اظہار دینے۔ بہت سے ہندوستانی ولایت گئے تھے۔

[2] مدراس کا مشہور انگریزی روزنامہ کئی سال تک بڑی آب و تاب سے نکلتا رہا۔

دوسرا خط فرانس کے قیام کے بعد لندن سے ۱۹ راگست کا لکھا ہوا ہے
اس کے طویل اقتباسات بھی نہ لطف سے خالی ہوں گے نہ فائدے سے۔ اس لئے
اور بھی کہ اس میں ذکر ایک مشہور بزرگ قوم کی وفات کا ہے جن سے محمد علی سے
خاصی چشمک رہ چکی تھی۔ اپنی صحت اور بدپرہیزی کی تفصیل کے بعد لکھتے
ہیں :۔ "جمعہ کی صبح کو میں نے اپنا فاقہ ختم کیا۔ کیا معلوم تھا جس وقت میں
افطار کر رہا تھا اسی وقت سید امیر علی صاحب دنیا سے رخصت ہو رہے
تھے ...... گو کچھ عرصہ سے وہ صاحب فراش تھے تاہم کسی کو گمان نہ تھا
کہ وہ اس قدر جلد داعی اجل کو لبیک کہنے والے ہیں۔ یہاں جس طرح جینا
مشکل ہے اسی طرح مرنا بھی مشکل ہے۔ جس دن امیر علی صاحب کا انتقال
ہوا ہے لوگ چھٹیاں منانے جارہے تھے۔ تجہیز و تکفین کا سامان منگل تک
نہ ہو سکا۔ یورپین رسم کے مطابق پھولوں سے تابوت چھپ گیا ہوگا اس لئے
کہ جب میں قبرستان پہنچا تو قبر پھولوں سے بالکل ڈھکی ہوئی تھی ——
ووکنگ کی مسجد کے امام صاحب نماز جنازہ پڑھا چکے تھے اس قبرستان میں
ہزاروں ہی قبریں ہیں اور اس شہر خموشاں کا نام بھی NECROPOLIS ہے۔
ریل کی پٹری اس کے اندر تک آئی ہے۔ نہایت وسیع میدان میں باغ لگایا گیا
ہے جس کے چاروں طرف پختہ احاطہ کی دیوار ہے۔ نہایت عمدہ سڑکیں روشیں
چلنے پھرنے والوں کے لئے بنادی گئی ہیں۔ اس شہر خموشاں کے اندر اچھی خاصی
رسٹوراں بھی موجود تھی جہاں لنچ کھایا جاسکتا ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا حصہ
مسلمانوں کی قبروں کے لئے بھی ہے۔ یوں تو تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے والی کمپنی
نے سب کچھ کر دیا تھا لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ قبر کا رخ کسی قدر غلط تھا۔ لیکن
الحمد للہ کچھ زیادہ غلطی نہ تھی اور امام صاحب نے میت کا منہ صحیح طور پر

قبلہ کی سمت موڑ دیا تھا۔ ہم لوگ جب پہنچے تو قبرستان میں پندرہ بیس آدمی رہ گئے تھے جن میں لارڈ ہیڈلے اور پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سر لوئی ڈین تھے۔ سر لوئی ڈین نے مجھے پہچان کر اردو میں مزاج شریف کہہ کر میرا حال دریافت کیا اور فرمایا کہ ہاں میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میں جواب میں الحمد للہ کہہ کر اور ان سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھا ــــــ مسلمانوں کی قبریں غالباً پہلے یہاں نہ تھیں۔ جتنے کتبے ملے ان سب کو میں نے پڑھا اور معلوم ہوا کہ سب سے پرانی قبر ایک خاتون صفیہ احمد فارسی کی ہے۔"

یہ خط بھی جامعہ کی چھپی ہوئی تازہ کتاب خطوط محمد علی میں درج ہو چکا ہے۔ آگے چل کر اسی خط میں بمبئی، حیدر آباد، جہلم، راندیر اور مصر کی متعدد میتوں کی قبروں کا ذکر ہے اس کے بعد فوجیوں کی قبروں کی ایک بڑی طویل فہرست ہے۔ اس سے کچھ تو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ محمد علی سیاسیات کے علاوہ بھی انگلستان میں کیا کیا دیکھتے تھے اور کس نظر سے۔

"اس پر بھی وہ کام کر رہا ہوں جو نہ کسی اور سے ہو سکتا ہے اور نہ کوئی کرتا ہے، یا اثر لوگوں پر گفتگو سے اثر ڈالتا ہوں۔ ٹیلیفون پر رات دن باتیں ہوا کرتی ہیں خواہ ٹائمز کا فارن ایڈیٹر ہو خواہ برنارڈ شا . . . . .

وزیر ہند نے نہایت شرافت سے خود ہی دوبارہ آنے پر یہاں اصرار کیا اس طرح گھنٹہ بھر گفتگو کی اور مجھ سے اعتراف کیا کہ تم نے جو باتیں بتائیں وہ تو عجیب و غریب ہیں۔ پیچیدہ ترین مسائل پر جو سمجھ ہی میں نہ آتے تھے آج ایک روشنی کا سیلاب ٹوٹ پڑا۔ اسپیکٹیٹر کے ایڈیٹر سے دو گھنٹے باتیں ہوا کیں اور اس پر پورا پورا اثر پڑا۔ اسی طرح ٹائمز کے فارن ایڈیٹر سے ½-۱۰ سے ۱۲ بجے تک ٹیلیفون پر گفتگو ہو چکی تھی خود ہی اس نے ملنے کی خواہش کی سوا

گھنٹہ اس سے ہندوستان کے متعلق گفتگو ہوئی۔ یہ بھی گرویدہ ہو کر گیا۔"

یہ وہ وقت تھا جب اسی محمد علی نے جو اَب نہ مسٹر تھا۔ نہ مولانا بلکہ صرف دیوانہ، راونڈ ٹیبل (گول میز) کے بھرے مجمع میں اپنی موت کا اعلان کر دیا تھا۔ ہندوستان کا ساحل آخری بار چھوڑتے وقت بھی تو جب ایک مخلص نے بڑھ کے پوچھا تھا کہ "آخر آپ اس حالت میں جا کس لئے رہے ہیں؟" تو دیوانہ کی زبان سے پھٹ سے نکلا یہی تھا کہ "مرنے کے لئے"۔ سچے کی بات اللہ نے سچ بھی کیسی کر دکھائی!

---

(۱۱) غالب کا فلسفہ[۱]

فلسفہ کے نام سے گھبرائیے نہیں۔ فلسفہ موٹے موٹے نامانوس لغات، ثقیل و مغلق اصطلاحات کا نام نہیں۔ فلسفہ نام ہے خود شناسی کا، زینہ ہے خدا شناسی کا۔ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ عادات و اطوار کیا ہیں؟ خدا کیا ہے؟ ماسوا کیا ہے؟ ہمارے جذبات کیا ہیں؟ ہمارے گرد و پیش کیا ہے؟ بس یہی روزمرہ کے مسئلے ہیں جن سے ہم کو آپ کو سب کو دوچار ہونا پڑتا ہے کبھی جان کر اور کبھی انجان۔ انھیں کو عقلی اصول پر ایک خاص نظام کے ماتحت ترتیب دے لیجئے اور لیجئے آپ فلسفی ہو گئے۔ پھر غالب غریب کینٹ اور ہیگل کے کینڈے کے تو انسان تھے بھی نہیں۔ ایک خوش باش، زندہ دل، خوش فکر، طبیعت دار آدمی، باتیں کرتے تو ذرا گہری۔ نظر سطح کی نہیں عمق کی عادی۔ چھلکے پر پڑ کر پھسل جانے والی نہیں۔ مغز تک پہنچ جانے کی خوگر سوجھ بوجھ غضب کی۔ اپنے ان حکیمانہ تجربوں اور عارفانہ مشاہدوں کو ادا کرتے تو کبھی پیاری نثر میں کبھی دلآویز نظم میں۔ کبھی شعر

---

[۱] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن۔ ۱۶ر فروری ۱۹۴۲ء کی شام کو۔ وقت: ۱۵ منٹ۔ (بہ سلسلہ یوم غالب)۔

کا ساز ہاتھ میں اُٹھا لیتے کبھی نثر کے مائیکروفون کو منہ لگا لیتے۔ شہرت شاعری کی زیادہ ہوگئی ورنہ تحقیق کے راوی کا تو یہ بیان ہے کہ نظم و نثر دونوں کے ماہر تھے، مالک تھے، بادشاہ تھے۔ نثر لکھنے بیٹھے تو قلم میں یہ قدرت کہ جب چاہا روتوں کو ہنسا دیا، جب چاہا ہنستوں کو رُلا دیا۔ شعر کہنے پر آئے تو زبان میں یہ اثر کہ سننے والوں کو لٹا دیا، مرجھائے دلوں کو کھلا دیا۔ فطرت بشری کے راز دار ہی جو ٹھہرے اور حکمت و معرفت کے شیدائی۔ معنویت کے بول لطافت و ظرافت کے سُروں میں الاپتے۔ ابھی آہ کا رنگ جما دیا ابھی واہ کا نقش بٹھا دیا۔ یہ تھی ان کی حکمت۔ یہی ان کا فلسفہ۔ یہی ان کی شاعری کا پیام۔ یہی ان کی زندگی کا کارنامہ۔

دل فطرت سے شوخ لیکر آئے تھے اور دماغ بیدار۔ شعر کمسنی ہی سے کہنے لگے تھے۔ جو رنگ طبیعت کا شروع سے تھا آخر تک رہا۔ جوں جوں سن بڑھتا گیا پختگی آتی گئی۔ دنیا کی بے ثباتی، کائنات کی بے حقیقتی کا نقش شروع ہی سے دل پر بیٹھ گیا تھا۔ جوانی کا زمانہ رندی و سرمستی کا ہوتا ہے۔ جھومتے جاتے ہیں لیکن اس بیہوشی میں اتنا ہوش رکھتے ہیں ؎

قطع سفر ہستی و آرام فنا ہیچ　　رفتار نفس بیشتر از لغزش پا ہیچ
کس بات پہ مغرور رہے اے عجز تمنا　　سامان دعا وحشت و تاثیر دعا ہیچ

زبان کی سلاست، ترکیبوں کی صفائی اس سن میں کیسے آسکتی تھی لیکن خیال کی ندرت، طبیعت کی جدت اس نومشقی میں بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

مہینے کا نیا چاند ہم آپ سب ہی دیکھتے ہیں لیکن حضرت غالب کا دیکھنا ہی کچھ اور تھا۔ حکیمانہ نظر نے دیکھا اور نکتہ پیدا کیا کہ چودھویں کا جو اتنا بڑا طباق سا چاند ہوتا ہے وہ آخر پیدا ہوتا ہے اس منحنی کم رو اور خیال کی طرح نازک و باریک

ہلال سے گویا کمال کی بنیاد ضعف و اضمحلال ہی سے پڑتی ہے۔

بدر ہے آئینہ طاق ہلال غافلاں! نقصاں سے پیدا ہے کمال

مذہب کے تشدد سے، ظاہری رسوم کی سختیوں سے اور فریقیانہ غلو سے تنگ آکر کہتے ہیں کہ سکون خاطر منظور ہے تو بس توحید سے لو لگا لیجئے وحدت کی خانقاہ میں کنج نشیں ہو جائیے اور یک دان، یک بین، یک گو بن کر رہ جائیے ؎

تا چند ناز مسجد و بت خانہ کھینچئے جوں شمع دل بخلوت جانانہ کھینچئے

کائنات سے انسان سبق لینا چاہے تو ذرہ ذرہ سبق دینے کو تیار رہے اس میں تاج محل اور فقیر کی جھونپڑی کی تفریق کیسی؟ حقیقت شناسی کی آنکھ کے لئے بجلی کا قمقمہ اور مٹی کا دیا دونوں ایک ہیں۔ فطرت کی مشاطہ صنعت و ربوبیت کی کنگھی دست قدرت میں لئے مانگ چوٹی اُن کی بھی درست کئے ہوئے اِن کی بھی۔ اس مضمون کو کہیں یوں ادا کیا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اور کہیں ان الفاظ میں باندھا ہے ؎

غافل یہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

موتی کی قدر و قیمت سب جانتے ہیں یہ فطرت بشری کا عارف کہتا ہے کہ موتی بنتا ہے پانی کے قطرہ سے۔ لیکن ایسا ہی پانی کا قطرہ ایک اور بھی تو ہے موتی سے کہیں زیادہ قیمتی۔ اسے حضرت انسان آنکھوں ہی آنکھوں میں رکھتے ہیں اور باہر اس وقت نکالتے ہیں جب چوٹ پڑ لیتی ہے دل پر نہ سہی کم از کم جسم پر سہی۔ سلسلہ موجودات میں جس کا جیسا ظرف ویسا ہی اس کا مرتبہ ؎

توفیق بہ اندازہ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

فرماتے ہیں کہ بشر کے گناہ بے شک بے حد و بیشمار، لیکن فطرت میں جو قدر شناسی عصیاں

طاقت گناہ رکھ دی گئی ہے وہ تو اس سے بھی کہیں زائد ہے۔ انسان گناہ کہاں تک کرے گا، جتنے بھی کرے گا پھر بھی بہت سے چھوٹ جائیں گے۔ کرسکتا ہوگا مگر کرے گا نہیں۔ پھر کیا وقت جب جزائے کامل کا آئے گا تو عادل حقیقی کی کریمی بندہ کی اس بناوٹ کا لحاظ بھی نہ رکھے گی؟ اس مضمون کو کئی کئی طرح ادا کیا ہے۔ کہیں یوں ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک   میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اور کہیں یوں ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد   یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اور کہیں یوں بھی ؎

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد   مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

رات کو شبنم پڑتے ہم نے آپ نے سب نے دیکھا ہے، چمن کی زمین بھیگی پڑی ہے کہ صبح آفتاب نکلا اور اس کی کرنوں کے ساتھ وہ ساری نمی رخصت۔ اس منظر پر بھی کبھی نظر پڑی ہوگی۔ غالب کی نظر اس پر بھی گڑ گئی۔ آفتاب کا کام تو زندگی دینا ہے نشوونما بخشنا ہے۔ اور بعض قدیم فلاسفہ کا مقولہ ہے کہ شبنم پیدا بھی آفتاب ہی سے ہوتی ہے لیکن اِدھر کرن پھوٹی اُدھر شبنم کا وجود بھی رخصت ہوگیا! کُل نے جزو کو اپنی طرف کھینچ لیا، اپنے میں جذب کرلیا۔ ظاہر میں فنا اور واقعتہً بقا حاصل ہوگئی۔ کہتے ہیں اور فلسفہ وحدت وجود کے اندر گم ہوکر کہتے ہیں کہ یہی حال انسان کا بھی ہے۔ ممکن الوجود کی تو عین تمنا یہی ہے کہ واجب الوجود اس پر توجہ کرے، اس پر تجلی رحمت کا عکس ڈالے اور اسے اپنے اندر جذب کرلے ــــــ بندہ کا وجود یوں بھی تو مالک کے سامنے بمنزلہ عدم کے رہتا ہے ؎

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم   میں بھی ہوں اک عنایت کی نظر ہونے تک

پھر یہی شربت دوسرے گلاس میں ؎

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے   کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستان کا

مخلوق کا وجود تو خود اس کی فنا کی دلیل ہے۔ وجود نہ ہو تو فنا کا عمل ہو کس چیز پر؟ مرزا فرماتے ہیں کہ بجلی کا گرنا تو سب نے دیکھا یہ بھی دیکھا کہ بیچارے دہقان کی کی کرائی محنت سب دم بھر میں غارت گئی اور جو غلہ کا انبار تھا وہ راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گیا لیکن دہقان ہی نے تو آخر دوڑ دھوپ کر کے اس آفت کا محل تیار کیا تھا اس آگ کے لئے مسالہ فراہم کیا تھا ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی   ہیولیٰ برق خرمن کا ہی خون گرم دہقاں کا

فنا کا رنگ حضرت غالب پر شروع سے غالب رہا۔ شوخیوں اور رنگینیوں کے درمیان غالب رہا، رندی اور آزاد مشربی کے باوجود غالب رہا۔ کہیں کہیں تو یہ لے ہلکی ہے دھیمے سُروں میں کہتے ہیں ؎

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے   بے صدا ہو جائیگا یہ ساز ہستی ایک دن

لیکن اکثر یہ مستقبل کا صیغہ حال سے بدل گیا ہے اور صاف صاف کہنے لگے ہیں کہ یہ وجود اب بھی نابود ہے اس کاروبار حیات کی مثل طلسمات نمود ہے، حقیقتہً معدوم اور صرف بظاہر موجود ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ   عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

برطانیہ میں ایک فلسفی عرصہ ہوا بارکلے کے نام کا گزرا ہے وہ بھی کچھ ایسی ہی تعلیم دے گیا ہے۔ پھر کہتے ہیں ؎

ہاں کھائیو مت فریب ہستی   ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں ؎

عالم غبار وحشت مجنوں ہے سر بسر　　کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

اور پھر کہتے ہیں اور فلسفہ کی خشکی میں رنگینی پیدا کر کے کہتے ہیں ؎

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم　　لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

تلاش کیا جائے تو دیوان بھر میں شاید یہی مضمون سب سے زیادہ نکلے۔ خدا جانے کتنے مختلف طریقوں سے اسے پیش کیا ہے۔ عجب نہیں کہ یہ محض قال نہ ہو حال ہو۔

زندگی کی تلخیوں کے تجربہ نے معتقد اس کا بھی بنا دیا تھا کہ زندگی بھر اس بند سے رہائی پانے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ جب تک انسان اس آب و گل کی دنیا میں ہے کچھ بھی کرے ناسوتی جھگڑے بہرحال اس کا ساتھ چھوڑنے کے نہیں۔ مرزا کی آپ بیتی ان کی ذاتی ہی نہیں نوع بشر کی آپ بیتی ہے۔ لیکن شعر کے موزوں سانچہ میں لطیف قالب میں ادا تو انھیں کی زبان میں ہو رہی ہے ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہی مفہوم ردیف و قافیہ اور وزن کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ؎

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اور پھر عدم ہستی بنا جو کچھ اور جیسا کچھ بھی موجود ہے اس کی بھی بساط کیا اور پائداری کتنی ؎

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل　　گرمی بزم ہے بس رقص شرر ہونے تک

بعض ادنیٰ فلسفیوں اور ناقص قسم کے زاہدوں کو دیکھا ہو گا کہ خلق سے اپنے

آپ کو گو یا جدا کر لیتے ہیں اور ترک و تجرید کے معنی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ماں، باپ، بھائی، بہن، ہمسایہ اور ہم وطن کے حقوق کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ غالب کی اصطلاح میں اس کا نام وحشت ہے اور ان کا فرمانا ہے کہ اس وحشت کا مستحق تو خود اپنا نفس ہے نہ کہ دوسرے ؎

وارستگی بہانہ بیگانگی نہیں اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہو

حسد کا علاج اکثر حکماء اخلاق نے لکھا ہے مرزا صاحب کی تشخیص ہے کہ یہ مرض پیدا ہوتا ہے تنگ نظری سے اور اس لئے ان کے مطب میں اس کا علاج نظر کی وسعت ہے ؎

حسد سے دل گر افسردہ ہے سرگرم تماشا ہو کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

مذہب و اخلاق کی اصل اور بنیاد بہت سے حکیموں عارفوں کے نزدیک اخلاص ہے۔ غالب بھی اسی مشرب کے پیرو ہیں۔ ان کی شریعت شعری کا فتویٰ ہے کہ وضع داری بجائے خود قابل صد قدر و مستحق ہزار داد ہے ؎

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

بعض اہل باطن کا قول ہے کہ حکمت کاملہ کو منظور ہی جب یہ ہو کہ بندہ فلاں فلاں حدود کو توڑ دے تو اب بندہ کا اس سے جھجکنا اور رکے رہنا خود ایک معصیت اور خود بینی ہے۔ یہ مضمون اب مرزا صاحب کی زبان سے سنئے ؎

جب کرم رخصت بیباکی و گستاخی دے کوئی تقصیر بجز خجلت تقصیر نہیں

یہی مفہوم ایک دوسرے دلکش انداز میں ؎

کر رہا ہوں میں اسے نامۂ اعمال میں نقل کچھ نہ کچھ روز ازل تم نے لکھا ہی تو سہی

عارف اور عاقل سب ہی کہتے آئے ہیں کہ نامحدود کا پورا پتہ محدود کیسے چلا سکتے ہیں اور جو مطلق ہے اسے کوئی مقید اپنے عقل و فہم کی گرفت میں

کب لا سکتا ہے؟ یافت ہر ایک کی بس اپنے مرتبہ کے لائق ہوتی ہے۔ غالب نے بھی اس حقیقت کو پایا ہے اور ذرا دیکھئے گا کس شاعرانہ بانکپن سے اسے اپنے انداز میں دُہرایا ہے ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

ذات کے طالب کو بھلا تجلی صفات سے کب تسلی ہو سکتی ہے؟ غالب صوفیوں کی بتائی ہوئی، عارفوں کی سمجھائی ہوئی اس حقیقت کو دُہراتے ہیں اور بیان میں شوخ زبانی کا پیوند لگاتے جاتے ہیں شاید اس لئے کہ شاید سُننے والے کہیں بھول نہ جائیں کہ غالب خانقاہ کے بوریہ پر نہیں مسند پہ بیٹھے ہوئے ہیں ؎

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

عبرت کا رنگ کلام میں ہمیشہ سے موجود تھا۔ سن بڑھتا گیا اور یہ رنگ پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ قطعہ ارشاد ہوا سرتاسر مرقع مدت العمر کے تجربات کا نچوڑ، سارے فلسفہ حیات کا خلاصہ، روداد زندگی لب لباب

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل
زنہار گر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
دامان باغبان و کف گل فروش ہے

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

قطعہ کیا ہے گویا شاعر کا وصیت نامہ ہے اس قطعہ کا زمانہ صاحب غالب نامہ

کی تحقیق ہے کہ ۱۸۲۰ء ہے گویا غالب کی عمر اس وقت کل ۲۰ سال کی تھی۔ اگر یہ صحیح ہے تو کہنا چاہیے غالب عین جوانی ہی میں بوڑھوں کے ہم سن ہو چکے تھے۔

آخر عمر کے خطوط حسرت اور فنا کے مضامین سے پٹے پڑے ہیں۔ ۱۹ر جون ۱۸۶۳ء کو یعنی اپنی وفات سے چھ سال قبل ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"روح میری اب جسم سے اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل کوئی اختلاط کوئی جلسہ کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، یہ جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقعہ ہے۔

خرم آں روز کزیں منزل ویران بردم"

منزل ویراں کی ویرانی کا احساس روز بروز بڑھتا گیا۔ ایک دوسرے مکتوب میں وفات سے ساڑھے تین چار سال قبل نومبر ۱۸۶۵ء میں تحریر کرتے ہیں :-

"نمائش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں! خود اس نمائش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں۔ لا الٰہ الا اللہ۔ لا موجود الا اللہ۔ لا موثر فی الوجود الا اللہ۔"

آخری زمانہ کے خطوط میں عموماً اپنا نام خاتمہ پر یوں لکھتے ہیں۔ "نجات کا طالب غالب" "مرگ ناگہاں کا طالب غالب" اور ایک آخری خط کی بالکل آخری سطریں یہ ہیں :-

"زندہ ہوں مردہ نہیں۔ بیمار بھی نہیں۔ بوڑھا، ناتواں، مفلس، قرضدار، کانوں کا بہرہ، قسمت کا بے بہرہ زیست سے بیزار، مرگ کا

اُمیدوار، غالبؔ۔

جوانی میں کبھی یہ شعر کہا تھا۔ زبانوں پر آج تک چڑھا ہوا ہے اور معنی خدا معلوم کیا کیا لئے جا رہے ہیں ؎

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

اردو کے اس بہترین غزل گو کی زندگی بجائے خود ایک غزل تھی اور اس غزل کا مطلع آپ نے ابھی سُن لیا ہے اب مقطع بھی سُن کر فاتحہ خیر کے لئے ہاتھ اُٹھا دیجئے۔ حالؔی کی روایت ہے کہ آخر وقت بار بار اپنے اس شعر کو پڑھا کرتے ؎

دم واپسیں بر سر راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے
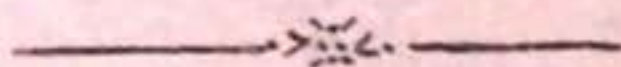
(۱۲) عید کا دن[1]

عید کا دن ہماری بول چال اور شاعروں کے روزمرہ میں اگر اپنا ثانی کوئی رکھتا ہے تو وہ شب برات کی رات[2] ہے۔ گویا یاروں کا کہنا یہ ہے کہ شب برات اگر نام ہے حلوہ اُڑانے کا، آتشبازی چھڑانے کا، تو عید بھی نام ہے گلے ملنے ملانے کا، سوئیاں کھانے کھلانے کا! ـــــ لیکن شعر و شاعری کے "ضلع" اور ادب کے "اردو بازار" سے اگر دینداروں کے عبادت خانہ کی طرف قدم رنجہ فرمایئے تو نقشہ ہی جدا پایئے۔

فجر کے اول وقت اذان ہوئی کہ گھر گھر چہل پہل شروع ہوگئی۔ بچے روز جگانے سے بھی نہیں جاگتے تھے آج بے اٹھائے آپ ہی اُٹھ بیٹھے۔ رات بھر مارے خوشی کے نیند ہی کسے آئی تھی؟ بڑے بوڑھوں نے رات کی نفلیں تک

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ ۱۲ راکتوبر ۴۲ء کی شام کو۔ وقت: ۱۲ منٹ۔

[2] کوئی صاحب بان نہ پکڑیں کہ "شب" کے ساتھ یہ رات کیا معنی؟ اہل زبان کی زبان پر چڑھا ہوا یوں ہی ہے۔ نواب مرزا شوق۔ ع سمجھو اس کو شب برات کی رات

تو چھوڑی نہ تھیں دعائیں مانگتے مانگتے صبح ہی کر دی تھی۔ پھر جماعت میں دیر کیوں کرنے لگے۔ آج مسلمان کے گھر میں مہمان ہے جسے دیکھئے اپنی جگہ لوٹی کو ہتے[1] بنا ہوا غسل کے انتظام میں سرگرم ــــــ مہینہ بھر آخر روح کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا ہے نفس کو طرح طرح صیقل کیا ہے، حق ہے کہ آج جسم بھی روح کی ہمرنگی اختیار کرے اور ظاہر باطن کی لطافتوں کا ساتھ دے!

غرض نکھری روح، ستھرا جسم، اُجلے کپڑے، روزہ دار مسلمان اس شان اور اس آن کے ساتھ گھر سے نکلا، غریبوں کی ضرورتیں پوری کرتا ہوا، یتیموں بیواؤں کے حلق میں دانہ ڈالتا ہوا، مفلسوں کی کھلی ہوئی مٹھیاں بند کرتا ہوا کہ شریعت میں اس کا نام صدقہ فطر ہے اور یہ واجب ہے۔ کوئی دینے میں دیر کرے گا تو اپنے ہی روزوں کے اجر کو ادھڑ میں لٹکائے رہے گا۔ قدم عید گاہ کی راہ پر پڑ رہے ہیں اور زبان ولب ہیں کہ اللہ کا نام جپ رہے ہیں ــــــ آج مسلمان کی خوشی کا دن ہے۔ آج وہ اپنے سالانہ جشن میں پورے ارمان نکال کر رہے گا ــــــ گانا بجانا، ناچ نہ مجرا، گالیاں نہ بدمستیاں۔ زبانوں پر بس نعرہ تکبیر اور زمزمہ توحید۔ اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد۔ اللہ اللہ مسرت کی مدہوشیوں میں اتنا ہوش۔ دو ایک دن نہیں پورا مہینہ انھوں نے مجاہدوں میں گزار دیا ہے دن دن بھر بھوکے رہے ہیں۔ پیاسے رہے ہیں۔ کھانے کے ایک دانہ سے پانی کے ایک قطرہ سے اپنے کو روکے رہے ہیں۔ راتیں جاگ جاگ کر کاٹی ہیں۔ تراویح کی لمبی لمبی نمازیں پڑھی ہیں۔ تہجد کے بعد لمبی لمبی دعائیں مانگی ہیں۔ عید کی مسرت انھیں نہ ہوگی تو اور کس کو ہوگی؟

دن خاصہ چڑھ چکا۔ گلی گلی سے مسلمان نکل رہے ہیں، بوڑھے بھی، بچے بھی، ادھیڑ بھی۔ کوئی پیدل کوئی سوار۔ سب عید گاہ کی طرف روانہ۔ کوئی میلہ ہے؟ کوئی

[1] علاج بالغسل

تماشہ ہے؟ کوئی دنگل ہے؟ کوئی کارنیوال ہے؟ جی نہیں صرف نماز پڑھنے، ایک ان دیکھے حاکم کے آگے جھکنے اور گرنے۔ لیکن یہ اتنی بڑی تعداد میں نمازی کہاں سے پیدا ہوئے؟ نماز تو آخر روز ہی فرض تھی روز اتنا مجمع کیوں نہیں ہوتا؟ اور اس ہجوم میں تو وہ بھی نظر آرہے ہیں جو ایک ایک اٹھوارہ کیا معنی ایک ایک سال گزر جاتا ہے اور سجدہ نہیں کرتے تو یہ بات کیا ہے جو عید گاہ کی کشش ان بے نمازیوں کو بھی کھینچے لئے جا رہی ہے؟ —— یاد آیا وہ ایک بچے نے کہا تھا نہ کہ عید کے تڑکے سے ایک اللہ کا فرشتہ پکار کرتا رہتا ہے کہ لوگو نماز کے لئے چلو۔ ہو نہ ہو یہ اسی کا اثر ہے اسی نور کا ظہور ہے۔ فرشتہ کی آواز سننے کی تاب تو بھلا ہمارے یہ مادّی کان کیا لا سکتے ہیں۔ لیکن دل کے کانوں نے سُنا اور سال سال بھر کے بے نمازی آج نمازی بن گئے۔

عید کا دن صدقہ و خیرات کا دن ہے۔ چھٹی نماز کا دن ہے۔ مالی اور بدنی دونوں عبادتوں میں مزید اضافہ کا دن ہے۔ اللہ اور بندوں دونوں کے حق ادا کرنے میں اور زائد فکر و اہتمام کا دن ہے۔ عید کی نماز روز کی پانچ نمازوں کے علاوہ ایک چھٹی نماز ہے۔ صبح کے بعد اور دوپہر سے پہلے —— رکعتیں کل دو۔ لیکن تکبیریں کئی زائد —— عید گاہ! عید گاہ کا نام کئی بار آچکا۔ خیال ہوتا ہوگا کہ کوئی بڑی عالیشان عمارت ہوگی، آراستہ و قابل دید —— جی یہ کچھ نہیں نہ تصویریں نہ فرنیچر۔ نہ ہال نہ برآمدہ، نہ دالان نہ شہ نشین۔ نہ بالاخانے نہ دریچے۔ مکانیت اتنی بھی نہیں جتنی کہ معمولی مسجد کی ہوتی ہے۔ پٹی ہوئی چھت تک سے محرومی۔ دھوپ کا بچاؤ نہ بارش سے پناہ۔ بس ایک لمبی سیدھی سی قناتی دیوار مغرب کی جانب، بیچ میں ایک ممبر اور سامنے ایک چبوترہ۔ کل یہ کائنات اور اس میں کشش اس غضب کی! —— بے جسم ویے مکان، بے صورت و

بے تصویر والے خدا کی عبادت گاہ ہونی چاہیے بھی ایسی ہی سادہ، ایسی ہی بے رنگ!
خالق کی عظمت اور مخلوق کے ہیچ ہونے کا تصور جیسا اس ماحول میں پیدا ہو سکتا ہے
اور کہیں کہاں ممکن؟

نمازی جمع ہو چکے تو اب نماز کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ گھنٹہ گھنٹی تو کبھی بھی نہیں ہوتا آج اذان بھی نہ ہوئی۔ خلقت خود ہی ٹوٹی پڑتی ہے دوڑی ہوئی کھنچی ہوئی چلی آرہی ہے پھر بلانے کی، پکارنے کی ضرورت ہی کیا۔ صفیں کھڑی ہونے لگیں اور کچھ دیر ان کی درستی ہوتی گی۔ اسلام کا نظام سارے کا سارا نیم عسکری ہے۔ صفوں کی درستی کی اس میں بڑی اہمیت ہے۔ اس کی قدر کوئی فوج والوں سے پوچھے۔ خیر صفیں ٹھیک ہو گئیں اور سب ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔ بوڑھے بھی جوان بھی، امیر بھی، غریب بھی، خادم بھی، مخدوم بھی، زردار بھی، نادار بھی، محمود بھی، ایاز بھی، عطر میں ڈوبے ہوئے رئیس، پسینے میں لت پت مزدور بھی، قدم سے قدم ملائے ہوئے، شانہ سے شانہ بھڑائے ہوئے۔ سب ایک ہی امام کے پیچھے، اس کی ایک آواز پر سب اس کے پیچھے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ اسی کی آواز پر سب ایک ساتھ جھکیں گے۔ سب ایک ساتھ گریں گے۔ سب ایک ساتھ اٹھیں گے۔ شخصیتیں مٹ گئیں تفرقے فنا ہو گئے پرزے مشین میں فٹ ہو گئے، اینٹ اینٹ سے جڑ کر دیوار بن گئی —— عبودیت کے روحانی پہلوؤں کو چھوڑیئے۔ ربط اجتماعی کا عجیب و غریب نظارہ! اپنوں کو قدر ہو یا نہ ہو باہر کے اہل نظر و نظم و اطاعت (ڈسپلن) کے اس پُر اثر منظر پر لوٹ لوٹ گئے ہیں۔ امریکہ کے ڈاکٹر DEVISAN اور یورپ کے بشپ LAFRAY اور سر ٹامس آرنلڈ۔ یہ تین نام تو اس وقت برجستہ یاد ہی پڑ گئے۔
امام نے سلام پھیرا تو سب ہی نماز سے باہر آگئے۔ اب خطبہ کی باری آئی۔

امام نے خطبہ سُنایا اسلام کی سرکاری زبان عربی میں عید کے مسائل اور عید کے فضائل پر۔ یہ بھی ہولیا تو اب دعا کے لئے ہاتھ اُٹھے اور دعا مانگی گئی ذرا لمبی سی۔ اس کے بعد سب اُٹھ کھڑے اور واپسی شروع ہوئی۔ عیدگاہ کے باہر جو دُکانیں لگی ہوئی ہیں ان کی سیر کرتے ہوئے، سودا خریدتے ہوئے دین کے تحت اور ضمن میں دنیا کا بھی نفع کماتے ہوئے ـــــ بازار کا سماں دکھانے میں کوئی سرور کا قلم اور فسانۂ عجائب کی زبان کہاں سے لائے! حلوائی صاحب ہیں کہ گاہکوں کے پرچانے میں، لبھانے میں، خود ہی قند کی طرح گھلے جاتے ہیں باتیں وہ میٹھی میٹھی بناتے ہیں کہ سُننے والے ہونٹ چاٹتے رہ جاتے ہیں۔ کبابیوں کے ہاں کی خوشبو ناک میں آجائے تو منعم کے منہ میں پانی بھر آئے۔ اور مفلس کا دل حسرت سے خود کباب ہوجائے ہوا دیتے جاتے ہیں ـــ سرخ سرخ کوئلوں کو بھی اور خریداروں کی آتشِ شوق کو بھی۔ کہیں چائے کے دَور دلوں کو گرماتے ہوئے کہیں کھلونے والے اپنی صداؤں سے آسمان سر پر اُٹھائے ہوئے۔ اِدھر پھیری والوں کی چیخ پکار۔ اُدھر حقّہ، پان، سگریٹ کی دوکانوں پر بہار نانبائیوں کے ہاں دیگیں چڑھی ہوئیں، برف والوں کے ہاں قفلیاں جمی ہوئیں۔

نمازیوں کی واپسی ہوئی تو دوسرے راستہ سے اور اس راستہ میں بھی وہی توحید کا کلمہ پڑھتے پڑھاتے، اللہ کی حمد سُناتے، اللہ کی بڑائی جتاتے۔ گھر سے نکلے تھے عبدیت کا فرض ادا کرنے، گھر میں داخل ہوئے اس فرض کو ادا کرکے۔ دن بھر ملنے ملانے میں صرف ہوا، دوستوں سے، عزیزوں سے، اپنوں سے بیگانوں سے، جن کے ہاں کبھی نہیں جاتے تھے، آج جائیں گے جو اُن کے ہاں کبھی نہیں آتے تھے آج آئیں گے۔ خاطرداریاں، مہمان نوازیاں دن بھر جاری رہیں گی۔ اس میں نماز ظہر کی بھی ہوگی عصر

کی بھی۔ یہاں تک کہ وقت مغرب کا آجائے گا اور اللہ اکبر کی آوازیں بلند ہونا اور انسانی حلق کے Transmitter سے یہ نشر ہونا تمام ہوگا۔ شروع ہوا تھا اللہ کی کبریائی کے اعلان سے، ختم ہوگا اللہ کی کبریائی کے اعلان پر!

(۱۳) شکوہ اور جواب شکوہ[۱]

جو زبان خوگر تھی حمد و ثنا، شکر و مناجات کی وہ آخر ایک بار گلہ و شکوہ پر کھلی۔ یا یوں کہئے کہ کھلوائی گئی۔ آقا کا کرم جب خود ناز برداری پر آمادہ ہو جائے تو کون بندہ ہے جو "نیاز" کے فرش زمیں کو چھوڑ کر "ناز" کی فضا میں اُڑنے نہ لگے — عبدیت کی دنیا میں سنتے ہیں گریہ یعقوبی[ع] کے ساتھ ساتھ ایک منزل تبسم سلیمانی[ع] کی بھی تو آتی ہے۔

اقبال کے "شکوہ" میں (شاعر اس وقت تک شاعر اسلام بن چکا تھا) بندہ اپنے خالق سے گویا روٹھ کر کہتا ہے کہ واہ بیگانوں پر، باغیوں پر، سرکشوں پر تو لطف و نوازش کی یہ بارشیں اور ہم اہل توحید کی یہ حالت زار کیا یہی ہماری وفاکیشی کا صلہ ہے یہی ہماری توحید پرستی کا انعام ہے؟

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی ۔۔۔ اور تیرے لئے زحمت کش پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی ۔۔۔ کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی؟

---

[۱] دہلی ریڈیو اسٹیشن سے - ۲۱ اپریل ۱۹۴۳ء کو۔ وقت: ۵ منٹ۔ (بہ سلسلہ یوم اقبالؒ)۔

لیکن "شکوہ" نام ہی کا شکوہ ہے۔ مضمون وہی حمد و مناجات کا اس لفافہ کے اندر بھی موجود ہے۔ ہر طنز میں عبدیت کی چاشنی۔ ہر گلہ میں توحید پرستی کی شیرینی۔

اقبال کی اردو شاعری کی شہرت و عظمت کی اصل بنیاد یہی شکوہ ہے۔ خوب چلا۔ خوب پھیلا۔ جو کچھ بھی نہ سمجھے انھوں نے بھی مزے لے لے کر پڑھا اور جو مطلب بالکل الٹا سمجھے انھیں تو اپنی گویا آزاد خیالی کے لئے ایک سند و دستاویز ہاتھ آ گئی۔

حکیم ملت کہ ملت کا نباض تھا۔ قوم کے رگ و ریشہ سے واقف تھا، بھانپ گیا جو آب حیات کا قطرہ تھا وہ شیشوں اور گلاسوں تک پہنچتے پہنچتے زہر کی بوند بن گیا۔ معاً پلٹا اور شکوہ کے جواب میں "جواب شکوہ" کہہ ڈالا۔ جوش و خروش وہی۔ زور بیان وہی۔ البتہ حقائق زائد۔ حقیقتوں کی تعبیر کھلی ہوئی اور صداقتوں کا اظہار فاش و برملا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ وہ "وعدے تو مسلموں اور پرستاران توحید کے لئے تھے۔ تم مسلم اور موحد ہو کب؟ نظر قال پر نہیں اپنے حال پر کرو۔ اپنے اعمال پر کرو۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو — پھر پسر قابل میراث پدر کیونکر ہو؟
حیدری فقر ہے نے دولت عثمانی ہے — تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟

عوام اپنے جذبات کی ترجمانی "شکوہ" میں زیادہ پاتے ہیں اس لئے پست مذاق طبقہ آج تک شکوہ پسند ہی چلا آ رہا ہے حالانکہ 'جواب شکوہ' کی سطح "شکوہ" سے کہیں بلند ہے۔ "شکوہ" والا اقبال ایک صاحب حال سالک ہے۔ "جواب شکوہ" والا اقبال ایک صاحب مقام عارف ہے۔ پہلے کے قدم اقلیم قلب کی وادیوں میں۔ دوسرے کی نگاہ فضائے روح کی بلندیوں میں۔

(۱۴) آدمی نامہ[1]

آدمی، سچ کہا جس نے کہا خلاصۂ کائنات ہے۔ سُدھرنے پر، بڑھنے پر، سنورنے پر آئے تو فرشتوں پر چھا جائے۔ اور گھٹنے پر، گرنے پر، بگڑنے پر آئے تو شیطان بھی اس سے نیچا دیکھ جائے۔ مذہب کی اس بتائی ہوئی اور اخلاق کی اس سُجھائی ہوئی حقیقت کو نظیر اکبر آبادی نے ادا کیا ہے آدمی نامہ میں شعر کی زبان شاعرانہ آن وبان سے، شاعری کے ساز و سامان سے۔

نظم کچھ ایسی بڑی نہیں۔ مخمس کے کل سترہ ہی تو بند ہیں اب تو مخمس کا رواج ہی اُٹھ گیا۔ نظیر کے زمانہ میں شعر و سخن کی ایک بڑی کار آمد چیز تھی۔ ہر بند میں کئی کئی نظیریں آس پاس کی لاکر سامنے کی نظیر دکھا کر بتایا ہے کہ آدمی یہ بھی ہے وہ بھی۔ بلندی، پستی، نیرنگی کے بیشمار امکانات اس کے اندر موجود۔ کہتے ہیں ؎

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور — یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور — شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور

---

[1] دہلی ریڈیو اسٹیشن سے (لکھنؤ میں ریکارڈ کی ہوئی تقریر) ۲۰ جون ۱۹۴۳ء کی شام کو۔ وقت: ۵ منٹ۔ (بہ سلسلہ یوم نظیر)۔

اور ہادی رہنما ہے سو وہ بھی ہے آدمی

بات بات میں نصیحت اور افسانہ، حکایت، کہانی کے پردہ میں اخلاق کا سبق، مشرق کا پرانا دستور ہے اور اردو میں نظیرؔ کی قسم کے شعراء کا پورا ظہور رہے۔ زبان عام فہم، خیال پاکیزہ نظیرؔ کی اور بہت سی نظموں کی طرح آدمی نامہ کی بھی یہی خصوصیات ہیں۔ زبان اب بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں انیسویں صدی کی ابتدا کی ذرا پرانی اور نامانوس تو ضرور ہو گئی ہے لیکن اس میں شاعر غریب کا کیا قصور؟ وقت کی رفتار اور اس کے لازمی اثرات کو کون روک سکا ہے؟

بہرحال آدمی نامہ لکھ کر اس مرد آدمی نے حق ادا کر دیا اپنے آدم زاد ہونے کا اور مصوری کر دی آدم سے پھیلے ہوئے نسل و خاندان کی!۔۔۔ انسانی برادری کا سبق، آدمیت کی تعلیم ہو الذی خلقکم من نفس واحدۃ کی تفسیر اس سے بڑھ کر اردو ادب میں اور کہاں ملے گی۔

---

(۱۵) نظیرؔ کی دلچسپی عام چیزوں میں[1]

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

شعر ہے تو اکبر الہ آبادی کا، لیکن اپنے سے ایک صدی قبل کے پیش رو نظیر اکبر آبادی کے حال کا آئینہ۔ ان کے کلام پر بہترین تبصرہ، اور ان کی شخصیت کا صحیح ترین اسکیچ یا خاکہ۔

آگرہ کا پُرانا نام اکبر آباد ہے۔ میاں نظیرؔ اپنے رنگ میں فرد و بے نظیر آج سے سوا سو، ڈیڑھ سو برس پہلے باشندہ تھے اسی ملک ہندوستان کے اور رہنے والے اسی شہر اکبر آباد کے۔ شاعری میں اپنی مثال آپ، اور انسان جیسے ہم آپ اسی آسمان کے نیچے سوتے اور اسی زمین پر چلتے جو کچھ دیکھتے دوسروں کو دکھاتے جو کچھ خود سُنتے اوروں کو سُناتے۔ دکھانا اور سُنانا کیسا؟ اس سے تو نکلتا ہے کہ شاید طبیعت پر زور دے دے کر کچھ کہتے ہوں۔ جی نہیں، یہ نہ کہیے کہ قدرت کی رنگا رنگیوں کو دیکھ کر کبھی ہنستے اور مسکراتے کبھی روتے اور بلکتے کبھی خوش ہوتے اور کبھی غمگین، اور اسی عالم میں کبھی کبھی گنگنانے بھی لگتے۔ بس یہی ان کی شاعری ہے۔ یہی ان کی ساحری ہے۔ وہ شعر سُنانے کیلئے نہیں بلکہ کہنے ہی کی خاطر کہتے۔ اس مقام کی شرح حضرت اکبر کی زبان سے سُنئے ؎

---

[1] دہلی ریڈیو اسٹیشن سے (لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن میں ریکارڈ کی ہوئی) جولائی ۱۹۴۲ء کی شام کو۔ وقت: ۱۰ منٹ۔

نہ اشعار ہیں یہ صلے کے لئے   نہ ان کے لئے ہیں نہ اُن کے لئے
کریں شعر کہتا ہوں اپنے لئے   بہت خوب ہے قول ہادی عزیز

انگریز فلسفی مل نے بھی تو کچھ ایسا ہی کہا ہے۔

Rhetoric is heard; poetry is overheard.

خطابت دوسروں کیلئے ہوتی ہے، اور شاعری اپنے لئے۔ وہ سُنائی جاتی ہے اور یہ سُن لی جاتی ہے۔ وہ شاعری کیا، جس کی نظر صرف خاص پر ہو، عام پر نہ ہو۔ بڑی چیزوں کو تو وہ دیکھے، اور چھوٹی چیزوں کی طرف سے اپنے کو نابینا کر لے۔ بیدل نے کانٹوں ہی سے کیسے کیسے گلدستے تیار کر دیئے۔ اور مولانائے روم (صاحب مثنوی) گھونگھوں اور سیپیوں سے کیسے کیسے موتی بر آمد کر لائے۔ آبدار اور تابدار! اور تو اور خود قرآن نے مکھی اور مچھر اور مکڑی کے نام لے لے کر سبق کیسے کیسے گہرے دیئے ہیں۔ یہ تو محض عامیوں اور سطحی دماغ والوں کا عقیدہ ہے کہ نتیجہ اہم اور دور رس نکالنے کے لئے پہلے نام بھی کچھ بڑے بڑے لے لینا چاہیئے! بچپن ہر شخص پر آتا ہے اور طوفان کی تیزی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ نظیر اپنے اس دور کو بڑھاپے میں یاد رکھتے ہیں ؎

کیا وقت تھا وہ ہم تھے جب دودھ کے چھوڑے
ہر آن آنچلوں کے معمور تھے کٹورے

بچپن کی بے فکریوں، آزادیوں، غیر ذمہ داریوں کے سماں ایک ایک کر کے ان کی نظر میں ہیں ؎

جانیں نہ بے قرینا نے سمجھیں کچھ قرینا   نے دوستی کسی سے دل میں نہ ان کے کینا
چھاتی سے ماں کے لپٹے خوش ان کو دودھ پینا   نے گرمیوں سے واقف نے جانتے پسینا
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

کس حسرت پہ آکر اس یاد کی تان توڑتے ہیں ؎

کیا عمر ہے عزیزو اور کیا یہ وقت ہے گا جب گھٹنیوں پہ آئے پھر اور کچھ تماشا
پانوں چلے تو واں سے پھر اور پیار ٹھہرا سب زندگی کا حظ ہے ان کو نظیر ہا ہا

برسات کے جھینٹوں سے سب ہی کھیلے ہیں، لیکن نظیر اکبرآبادی میں یہی نقش آکر مستقل تصویر کی طرح جم جاتے ہیں۔ مکانوں کے گرنے گرانے کا نقشہ برسات کی شدت میں کس خوبی سے کھینچا ہے ؎

جھڑیوں نے اس طرح کا دیا آکے جھڑ لگا سُنئے جدھر اُدھر کو دھڑاکے کی ہو صدا
کوئی پکارے ہے مرا دروزہ گر چلا کوئی کہے ہے ہائے کہو میں بتاؤں کیا
تم در کو جھینکتے ہو مرا گھر پھسل پڑا

کوچے میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رستہ کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا اس سب جگہ کے گرنے سے آیا جو بچ گیا
وہ اپنے گھر کے صحن میں آکر پھسل گیا

نظیر زبان بھی وہی بولتے ہیں جو ان کے ارد گرد بولی جاتی ہے۔ تصنع، آورد، ٹھونس ٹھانس اُن کے بیان میں نہیں۔ بناوٹ، تکلف، اغلاق اسی طرح اُن کی زبان میں نہیں۔ وہ وہی بولتے ہیں جو سنتے رہتے ہیں۔ وہی لکھتے ہیں جو پڑھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو غلطیاں ان کے زمانہ میں چلی ہوئی تھیں، وہ بے تکلف ان کی زبان پر بھی چڑھی ہوئی۔ نہ ان کا کلام کسی شرح و فرہنگ کا محتاج، نہ ان کی زبان کے سمجھنے کے لئے لغت کی ورق گردانی کی احتیاج۔ یہ اور بات ہے کہ اب وہ زبان ہی پُرانی ہوگئی۔ بہت سے لفظ متروک ہوگئے۔ ٹک، میاں، کہیو، تئیں، بیچ ("میں" کے معنی میں) کیونکہ (کیونکر کے معنی میں) وغیرہ اور بعض کے تلفظ بدل گئے۔ مثلاً "اوپر" اس وقت

"اُپَر" تھا۔ "تیئں" اس وقت "تیں" تھا۔ "اِدھر" اس وقت "ایدھر" تھا۔ "خواب" اس وقت "خاب" تھا۔

آرٹ (صنعت گری) کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ نیچر (فطرت یا طبیعت) کی بالکل ضد ہے۔ یہ تعریف اگر صحیح ہے تو نظیر قطعاً آرٹسٹ نہ تھے۔ اُن کا آرٹ تو تمام تر نیچر ہی کی نقاشی ہے، نیچر ہی کی نقالی ہے۔ اور اس معنی میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ نظیر اپنے زمانہ کے بہت بڑے "نیچری" تھے۔ وہ تخییل کے نہیں، دید کے قائل تھے۔ ان کے ہاتھ میں مصور کا قلم اور کوچی نہ تھی، پہلو میں فوٹو گرافر کا کیمرا لٹک رہا تھا!

خیال نہ گزرے کہ نظیر صرف واقعاتی شاعر تھے، وہ نصیحت کرنا بھی خوب جانتے تھے۔ نیکی کی طرف بُلانے کے فن سے خوب آگاہ تھے۔ کبھی آپ بیتی سُنا کر، کبھی جگ بیتی سُنا کر، کبھی جگ بیتی کے راگ گا کر، ایک بڑی حد تک اُستاد سعدیؔ کے رنگ میں۔ رنگ قبول بھی کچھ سعدی ہی کا سا حاصل ہوا۔ سعدیؔ کی کتابیں صدیوں تک لڑکوں کے درس میں داخل رہیں۔ نظیرؔ کی نظمیں بھی بیسیوں برس تک فقیروں نے گائیں۔ قلندروں کے گلے سے صدائیں بن بن کر نکلیں۔ اور کلام کا خدا معلوم کتنا حصہ اس وقت بھی لوگوں کی زبانوں پر چڑھا ہوا، اور گویا ادب اردو کا ایک مستقل حصہ بن چکا ہے۔ غزل کا ایک شعر مزاحیہ مضمون کا ضرور آپ نے سُنا ہوگا ؎

چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہ چلا ہوا شعر میاں نظیرؔ ہی کا ہے۔

یہ بیت بھی خوب چلی ہوئی ہے ؎

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

اور وہ بنجارہ نامہ والی مشہور نظم بے شمار لڑکوں کے درس میں شامل رہ چکی ہے۔ اور کتنوں کو اب بھی زبانی یاد ہوگی۔ وہی جس کا مشہور مصرعہ ہے۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلے گا بنجارہ

موت اور آخرت کی یاد دلانے اور عبرت اور دنیا کی بے ثباتی کا مضمون پیدا کرنے کے نظیر بادشاہ ہیں۔ کلیات میں ایک دو نہیں، بیسیوں نظمیں، نام اور عنوان بدل بدل کر، اسی ایک مفہوم سے متعلق ملیں گی۔ حمد الٰہی، فنا و بقا، تنبیہ غافلاں، انعام خدا، مکا مکر دنیا سب اسی قسم کے عنوان ہیں۔ مثال کے طور پر اس وقت صرف قصہ ہنس سنتے چلئے ؎

آیا تھا کسی شہر سے ایک ہنس بچارا
اک پیڑ پہ جنگل کے ہوا اُس کا گزارا

رہتے تھے بہت جانور اُسی پیڑ کے اوپر
اس نے بھی کسی شاخ پہ گھر اپنا سنوارا

دیکھا جو طیوروں نے اُسے حسن میں خوش رنگ
وہ ہنس لگا سب کی نگاہوں میں پیارا

بازو و جرہ و شاہیں ہوئے عاشق
شکروں نے بھی شکر سے کیا اس کا مدارا

زاغ و زغن و طوطی و طاؤس کبوتر
سب کرنے لگے اس کی محبت کا اشارا

جتنے غرض اس پیڑ پہ رہتے تھے پرندے
اور ہنس پہ اُن سب نے دل و جان کو وارا

کچھ روز کے قیام کے بعد ہنس کے کوچ کی گھڑی آگئی۔ ع

ایک روز وہ یاروں کی طرف دیکھ پکارا

لو یارو اب ہم جائیں گے کل اپنے وطن کو
اب تم کو مبارک رہے یہ پیڑ تمہارا

جانورستان بھر میں اس سے کھلبلی مچ گئی ؎

اس بات کے سنتے ہی جو سب اک کے اڑے ہوش
سب بولے یہ فرقت تو نہیں ہم کو گوارا

ہم جتنے ہیں سب ساتھ تمہارے ہی چلیں گے
یہ درد تو اب ہم سے نہ جائے گا سہارا

صبح نمودار ہوئی اور ؎

"پر اپنا ہوا پر وہیں اُس ہنس نے مارا"

سب ساتھ چلے اس کے وہ ہمراز و ہوا خواہ
ہر ایک نے اُڑنے کے لئے پنکھ پسارا

دو کوس اُڑے تھے کہ ہوئی ماندگی غالب
پھر پر میں کسی کے نہ رہا قوت و یارا

سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

اس قسم کی دلچسپ نصیحت آمیز شاعری مشرق میں "آرٹ" کا ایک جزو سمجھی گئی ہے۔ اور نظیر اس معیار پر پورے اور بہتوں سے کہیں زیادہ پورے اُترتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سادگی اور فطرت کی مطابقت اگر ایک طرف ان کی شاعری کا جمال ہے تو دوسری طرف ان کی انسانیت اور شخصیت کا کمال!

---

(۱۶) اکبر الہ آبادی[1]

ایک مختصر سی، لیکن صاف ستھری محفل مشاعرہ لکھنؤ میں آج سے کوئی پچاس ساٹھ سال قبل آراستہ ہے۔ طرح کی زمین ہے "ازل سے" "کل سے"۔ ایک شاعر کے سامنے جب شمع آئی تو مطلع ارشاد ہوا ؎

الجھا نہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے
مانگی نہ مدد دل نے مرے طول امل سے

اور داد کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ کلام میں بانکپن تھا ہی اس غضب کا اور اِس شعر پر تو محفل لوٹ لوٹ گئی ؎

ان کی نگہ مست ہے لبریز معانی
ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے

نگاہ یار کی مستی بہتوں نے باندھی ہے، اور شراب سے اسے تشبیہ بارہا دی جا چکی ہے، حافظ کی غزل تک اس کا رتبہ پہنچا دینا، یہ اِسی شاعر کی جدت طبع کا کرشمہ تھا۔ اور عجب کیا جو خود خواجہ حافظ کی روح بھی یہ اچھوتی داد سُن کر وجد میں آگئی ہو اور پھر جب اس شعر کی نوبت آئی ؎

حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تک چپ
ہیبت ترے پیغام کی ظاہر کہ اجل سے

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۶ء کی شام کو۔ وقت: ۱۰ منٹ۔

اور معاً بعد اس شعر کی ؎

درجہ مُتحیّر کا ہے بیخود سے فروتر ہے روح کو اُمید ترقی کی اجل سے

تو جو اہل دل تھے ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ اور اہل معرفت کی زبان پر بیساختہ مرحبا اور سبحان اللہ کے نعرے جاری ہو گئے ---- لیکن شاعر نے جب اس غزل کا یہ مصرعہ پڑھا کہ ع

قرآن ہے شاہد کہ خدا حُسن سے خوش ہے

تو سامعین میں بڑے گہرے مذہبی شخص خان بہادر منشی اطہر علی کاکوروی مرحوم موجود تھے ان کے تیور پر کچھ بل پڑنے لگے۔ حساس شاعر فوراً بھانپ گیا اور جھٹ پہلے مصرعہ کو مکرر پڑھ پورا شعر یوں سُنایا ؎

قرآن ہے شاہد کہ خدا حُسن سے خوش ہے
کس حُسن سے؟ یہ بھی تو سنو، حسن عمل سے

شعر کا زبان سے ادا ہونا تھا کہ داد و تحسین کی بارش ہر طرف سے ہونے لگی اور خان بہادر نے تو بے اختیار اُٹھ کر شاعر کو گلے لگا لیا۔

ان شاعر صاحب کو آپ نے پہچان لیا؟ یہی تھے۔ سید اکبر حسین اکبر۔ اس وقت غالباً منصفی کے عہدے پر تھے۔ آگے چل کر خفیفہ کے جج اور پھر سیشن جج ہوئے جو اس زمانے کے لحاظ سے ملازمت پیشہ ہندوستانیوں کی گویا ترقی کی معراج تھی۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو ہوئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کلیات کی تین جلدوں کے مصنف، اپنے وقت کے ایک نامور ترین شاعر ہوئے اپنے رنگ میں فرد!

برجستگی اور بدیہہ گوئی کے بادشاہ تھے۔ ایک نمونہ تو آپ ابھی سُن چکے ہیں اور معنی آفرینی ان کا حصہ تھی۔ مضمون ہر قسم کے جیسے ہاتھ باندھے

ان کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ جب جس مضمون کو چاہا۔ بہترین لفظی صنعت کاری کے ساتھ ادا کر دیا۔ سوچنے میں معمولی بات چیت کے وقت ہم کو آپ کو کچھ نہ کچھ وقت لینا پڑتا ہے۔ انھیں شعر کہتے اتنی دیر بھی نہ لگتی۔ اس نیاز مند کو مرحوم کی عمر کے آخری نو دس سال ذاتی نیاز مندی اور حضوری کا اچھا خاصہ اتفاق رہا۔ یہ بات اسی تجربہ کی بنا پر عرض کی جا رہی ہے۔ حضرت اکبر بوڑھے ہو چکے تھے۔ عمر ۶۴-۶۵ سے زائد ہو چکی تھی۔ ذہانت۔ شوخی۔ برجستگی۔ معنی آفرینی۔ لطافت زبان۔ حسن بیان یہ سب اوصاف اس وقت بھی جوان تھے۔ بات میں بات پیدا کرتے اور بعض دفعہ بے بات کی بھی بات پیدا کر لیتے۔ گفتگو میں خود ہنستے بہت کم تھے دوسروں کو ہنساتے بہت زیادہ رہتے اور ہنساتے ہنساتے کبھی رُلانے بھی لگتے کوئی چوٹ ایسی دل پر لگا دیتے کہ سننے والے کا دل درد سے بھر آتا۔ راگوں میں سنا ہے کوئی راگ ایسا بھی ہوتا ہے جو ساز کی جگہ سوز پیدا کر دینے میں تاثیر رکھتا ہے۔

پُرگوئی گویا ان پر ختم تھی تین کلیات تو صرف چھپے ہوئے ہیں باقی جتنا حصہ چھپنے سے رہ گیا۔ وہ بھی ایک کلیات یا ڈیڑھ کلیات سے کم نہیں۔ اور وہ شعر جو اکبر سخن گو نے کہے اور اکبر سخن سنج کو چھپنے کے قابل نظر نہ آئے ان کی تعداد ان کے علاوہ اصل ناموری غزل گوئی میں نہیں۔ نظم گوئی میں ہوئی۔ بلکہ اس کی بھی ایک خاص صنف یعنی مزاحیہ نگاری میں۔ لیکن غزلیں بھی جناب اکبر کی کسی سے کم نہیں۔ کم نہ تعداد و مقدار کے لحاظ سے اور نہ حسنِ معنویت کے اعتبار سے۔ دس منٹ کی مہلت میں اتنی گنجائش ہی کہاں۔ ورنہ اکبر کے عاشقانہ کلام کے کثرت سے نمونے پیش کر کر کے فیصلہ خود آپ ہی کے ذوق سلیم پر چھوڑ دیا جاتا۔

اکبر مذہب کے بڑے حامیوں اور مشرقیت کے خاص طرفداروں میں تھے اور یہ یاد رہے کہ یہ وہ وقت تھا جب "رفارم" یا اصلاح یا تجدد کا جھنڈا سر سید احمد خاں مرحوم کے ہاتھ میں تھا۔ اکبر ان کے معاصر تھے گو سن میں ان سے کہیں چھوٹے۔ اور علی گڈھ میں خود منصف رہ کر "رفارم" یا تجدد کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ کلام میں خوب خوب چٹکیاں لیتے جاتے تھے۔ لیکن یہ چٹکیاں بھی عموماً گدگدیوں ہی کے رنگ کی ہوتی تھیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

حاضر ہوا میں خدمت سید میں ایک رات — افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے وہ مجھ سے دین کی اصلاح فرض ہے — میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

کہیں کہیں یہ ظرافت طنز کی ہلکی سی نشتریت بھی پیدا کر لیتی ہے جیسے یہ شعر ؎

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے — شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

گزٹ کے معنی سرکاری گزٹ کے تو بالکل ظاہر ہیں۔ تلمیح یہ ہے کہ سر سید کے ہفتہ وار اخبار کا نام بھی "علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" تھا۔ یہ شعر ایک غزل کا ہے اور غزل کا مطلع ہے ؎

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا — بت کے بندے ملے، اللہ کا بندہ نہ ملا

یہاں تک جب آپ آگئے ہیں، تو ایک دو شعر اور بھی اسی غزل کے ہو جائیں تو کیا مضائقہ ہے ؎

گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش — طالب زمزمۂ بلبل شیدا نہ ملا
بزم یاراں سے پھری باد بہاری مایوس — ایک سر بھی اسے آمادہ سودا نہ ملا

اور ایک شعر مخصوص اکبری رنگ کا ؎

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے — کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

سیاست میں اکبر کا مذاق وہی تھا جو ہر خود دار مشرقی کا ہونا چاہئے۔ لیکن یہ میدان کے سپاہی اور اکھاڑے کے ڈنڑ پیل پہلوان نہ تھے، مجلس ادب کے مسند نشین اور بزم ظرافت کے پیر تھے۔ زبان کھولتے تو میٹھے میٹھے بولوں میں ایک پھلجھڑی چھڑا جاتے۔ ہنسی کی کھلکھلاہٹ سے سننے والوں کی پیشانیوں پر شکن قائم ہی کب رہنے پاتی۔

ایک رباعی کے پہلے مصرعہ میں فرماتے ہیں ؎

انگریز ہر ایک فن میں ممتاز بھی ہیں

دوسرے مصرعہ کے کچھ الفاظ بھول رہا ہوں۔ "دمساز بھی ہیں" کچھ اس طرح باندھا تھا۔ خیر جانے دیجئے۔ کام کے مصرعے آخر کے دو[۲] ہیں ؎

بابو کو نچادیا جو چابی دے کر ؛ اس سے یہ کھلا کہ دل لگی باز بھی ہیں[۱]

"بابو" کیا خوب! ایک طرف بابو یعنی کل انگریزی داں ہندوستانی اور دوسری طرف دکانوں پر بکنے والے چینی کے کھلونے کوک سے ناچنے والے ___ اور پھر چابی کی مناسبت سے دوسرے مصرعہ میں "کھلا"۔ کیا خوب! کیا خوب اس استادی کے آگے تو اچھے اچھے استاد بھی بند ہو جائیں۔

اکبر ذاتی حیثیت سے بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ ہر بڑے چھوٹے سے جھک کر ملنے والے، کسی کی دلشکنی نہ گوارا کرنیوالے، اور نماز و قرآن کے تو گویا عاشق، ایسا عشق جو اچھے اچھے عالموں درویشوں میں بھی کمتر ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ آج ۹ ر ستمبر کو ان کی پچیسویں برسی ہے فاتحہ خیر پر اس ذکر خیر کو ختم کیجئے۔

---

[۱] بعد کو پہلے دونوں مصرعہ بھی ایک دوست کے بتانے سے یاد پڑ گئے ؎

انگریز قوی بھی ہیں سرافراز بھی ہیں ؛ تدبیر میں علم و فن میں ممتاز بھی ہیں

(۱۷) دلم در عاشقی آوارہ شد![۱]

مصرعہ جو ابھی آپ کو سنایا گیا، آپ نے سُن لیا؟ ایک بار پھر عرض ہے۔ ع
دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا!

شاعر کس حسرت سے کہہ رہا ہے کہ میرا دل غم عشق میں مبتلا ہو چکا، اس میں حیران و پریشاں پھر رہا ہے، اس پر بھی جی یہ نہیں چاہتا کہ یہ غم ختم ہو جائے۔ اور اس آزار سے رہائی حاصل ہو جائے، بلکہ اس کے برعکس آرزو ہے تو یہ کہ یہ آوارگی، غم اور بڑھے۔ اور دل جتنا اب کڑھ رہا ہے، اس سے اور زیادہ کڑھے ___ اللہ اللہ، محبت کا درد بھی کتنا لذیذ درد ہوتا ہے!

اور دوسرے مصرعہ میں تکملہ آرزو کرتا ہے کہ
تنم از بے دلی بیچارہ شد بیچارہ تر بادا

دل کے طفیل جسم بھی تو خستگی و ناتوانی کا شکار ہو چکا ہے، کاش یہ خستگی اور ناتوانی بھی اور بڑھے۔ اور عشق کے چرکے اٹھانے اور غم کھانے میں جسم کا قدم دل سے پیچھے نہ رہنے پائے!

---

[۱] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۹ رنومبر ۱۹۴۶ء کی شام کو۔ وقت: ۱۰ منٹ۔

شعر ہم نے آپ نے سب نے سُن رکھا ہے کہ امیر خسروؒ دہلوی کا ہے اور امیر خسروؒ کا نام آتے ہی ذہن کے سامنے تصویر ایک بزرگ درویش پیر مرد کی آجاتی ہے —— تصویر درویشی اور بزرگی کی حد تک تو ممکن ہے کہ صحیح ہو لیکن کبرسنی کے پہلو سے تو قطعی غلط ہے۔ امیر کی یہ غزل اُن کے پہلے دیوان میں درج ہے۔ جس کا نام تحفۃ الصغر یا "کمسنی کا تحفہ" ہے اور اس کے دیباچہ میں ان کے قلم سے تصریح موجود ہے کہ اس کے اندر صرف ۱۶ سال سے لے کر ۱۹ سال تک کی عمر تک کا کلام ہے! —— تو گویا جس نے یہ پھڑکتا ہوا مطلع کہا اور درد عاشقی کی تصویر کھینچ دی، وہ ایک نوجوان لڑکا نکلا، زیادہ سے زیادہ ۱۹ سال عمر والا، اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بھی سال دو سال کم ہی کا! کمال ہے کلام میں یہ پختگی اور سِن کُل اتنا!

مطلع پر حیرت ختم ہو چکی ہو تو آگے بڑھئے۔ غزل کی غزل ایک رنگ میں ہے

بہ خونریز غریباں چشم تو عیارہ تر بادا	بہ تاراج اسیراں زلفِ تو عیاری دارد
دلت خارست پہرکشتنِ من خارہ تر بادا	رخت تازست بہر مردن خود تازہ تر خواہم

معنوی حیثیت سے مضمون کا تسلسل قائم ہے، اور تلازمے سب وہی چلے آ رہے ہیں۔ اور پھر اسیروں کے لئے "زلف" کی لفظی مناسبت اور "رخ" اور "دل" کا تقابل غرض صنعتیں بھی اُستادانہ! لفظ و معنی، دونوں کی پختگی کے اعتبار سے کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ کلام کسی صاحبزادہ کا ہے؟

غزل میں مسلسل مضمون شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ غزل کا جو عام دستور فارسی میں چلا ہوا ہے (اور وہیں سے اُردو میں آیا) وہ تو یہ ہے کہ ہر شعر ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صاحبزادے مستند اُستاد بہت بعد کو تسلیم کئے گئے، لیکن اُستادی کی یہ جھلک شروع ہی سے رکھتے تھے، کہ تسلسل مضمون

پر اُسی وقت سے قادر تھے! چوتھا شعر، جانِ غزل یہی شعر ہے ملاحظہ ہو ؎

گرائے زاہد دعائے خیر لی گومی مرا ایں گو
کہ ایں آوارہ کوئے بتاں آوارہ تر بادا

معلوم ہوتا ہے شاعر آشفتہ سر عشق پیشہ کو کسی زاہد بزرگ نے کہیں دیکھ پایا ہے۔ اور اس کی آشفتہ حالی پر ترس کھا کر اس کی فلاح و اصلاح کے لئے دعا کرنا چاہتا ہے، اور دعا قدرتاً یہی ہوتی کہ اس بیچارہ کو عشق سے نجات نصیب ہو۔ شاعر یہ صورتِ حال بھانپ جاتا ہے۔ حضرتِ زاہد کی عظمت زہد سے اسے بھی انکار نہیں۔ جانتا ہے کہ اس کی دعا قبول ہو کر رہے گی۔ قبل اس کے کہ زاہد کے ہاتھ دعا کے لئے اُٹھیں، شاعر کی زبان چل اٹھتی ہے۔ اور یہ عرض کرنے لگتا ہے کہ "حضّت خدا کے لئے کوئی اور دعا نہ کر بیٹھیے گا۔ دعا یہ فرمایئے کہ آزارِ عشق مجھ خستہ جگر کے لئے اور بڑھتا ہی جائے"۔

پانچویں شعر میں کہتا ہے ؎

دلِ من پارہ گشت از غم نہ زاں گونہ کہ بہ گردد
اگر جاناں بدیں شاد است یارب پارہ تر بادا

میرا دل تو غم سے ٹکڑے ٹکڑے، پاش پاش ہو چکا، جس کے جڑنے اور درست ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں (نہ زاں گونہ کہ بہ گردد) لیکن محبوب کی مرضی اگر یہی ہے۔ اگر وہ اسی میں خوش ہے، تو اے پروردگار یہ اور زیادہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اور اس سے زیادہ پاش ہو کر رہے۔

چھٹا شعر پھر اسی تمنا کا ترجمان ہے ؎

ہمہ گویند کز خونخوار ریش خلقے بجاں آمد　　من ایں گویم کہ بہر جانِ من خونخوارہ تر بادا

لوگ کہتے ہیں کہ محبوب کی سفاکی سے خلقت جان سے تنگ آگئی ہے، لیکن مجھے تو ارمان اس کا ہے کہ میرے حق میں اس کی سفاکی کچھ اور بڑھ ہی کر ہے!

ساتویں شعر پر پہنچ کر شاعر قلم رکھتا ہے تو اپنے حق میں یوں دعا گو ہوتا ہے ؎

چو باتر دامنی خو کردہ خسرو باد و چشم تر
بآب چشم مژگاں دامنش ہموارہ تر بادا

کہ رد کر اس غمزدہ کا غم اور ترقی پر لے ہے۔

سات شعر دیار عشق کی سات منزلیں تھیں۔ طے ہوئیں۔ گویا ایک ہفتخوان سر ہوا۔ یا یوں کہئے کہ شاعر کو ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آگئی —— "سات" کا عدد صوفیہ کے ہاں بڑا مبارک مانا گیا ہے۔ اور اکیلے صوفیہ ہی کے نہیں مشرقی مذہبوں میں عموماً ——

امیرؔ نے غزلوں پر غزلیں نہیں، دیوان پر دیوان لکھ ڈالے ہیں۔ غزلوں اور پھر غزل کے شعروں کا کوئی شمار ہی نہیں عشق و محبت، وصل و فراق۔ سوز و گداز کی مصوری خدا معلوم کے ہزار بار کامیابی اور رعنائی کے ساتھ کی۔ اور آخر کو استاد سخن، امام فن کہلائے۔ اس شاندار انجام کی خبر سب کو ہے، قابل رشک آغاز آپ نے دیکھ لیا؟

لیکن اس حیرت انگیز ابتدا کی لم بھی خیال شریف میں آئی؟ تذکرہ نویسوں کے قلم نے یہ تصریح جو کر دی ہے کہ امیرؔ ابھی آٹھ سال کے بچے تھے کہ پدر بزرگوار نے شیخ وقت، عارف باللہ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے قدموں پر لا کر ڈال دیا۔ اور خواجہ کی نظر قبول اسی وقت پڑ گئی۔ ادھر جو خود جوہر قابل۔ اتنے بڑے صاحب نسبت سے نسبت کہیں بیکار جا سکتی

تھی؟ دن دونی رات چوگنی ترقی شروع ہوگئی۔ قمقمہ "کرنٹ" آجانے سے جگمگا اٹھا ــــ خواجہ کا یہ قول بھی منقول ہے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے، تو عرض کروں گا خسرو کو!" اور تذکروں کی زبان پر یہ روایت بھی تو چڑھی ہوئی ہے کہ حضرت دعا مانگتے تھے تو امیر کی طرف اشارہ کرکے کہتے تھے کہ "الٰہی اس ترک کے سوز دل کے طفیل میں میری مغفرت کر" اس مرتبۂ راز و نیاز اور اس درجہ اختصاص کے بعد اس میں حیرت ہی کیا رہ جاتی ہے کہ اس پایہ کا کلام ایک کمسن کی زبان سے ادا ہوا ہے؟ محض شاعر، ردیف و قافیہ کے استاد و ماہر، ان مرتبوں تک پہونچ ہی کب سکتا ہے۔ یہ تو عشق حقیقی کی روح ہے۔ جو اس قال کو حال بنا دیتی ہے۔ اور الفاظ کے اندر معنویت پیدا کر دیتی ہے! عارف رومیؒ نے کیا خوب کہا ہے ؎

عشقہائے کز پئے رنگے بود عشق نہ بود عاقبت ننگے بود

دنیا والوں اور دنیا والیوں کا عشق بھی کوئی عشق ہے! اگر ناجائز محل پر ہے جب تو سراپا فسق، لیکن اگر محل جائز پر ہے، جب بھی آب و رنگ، نقش و نگار کی بہار کب تک؟ حسن و شباب کی طلسم بندی کے دن؟

ہے یہ حقیقتِ مجاز، اب یہ کھلا ہے جا کے راز
سب ہے فریب آب و گل، حسن و جمال کچھ نہیں

یہ قوت تو اسی اور صرف اسی حسن میں ہے، جو زوال و انحطاط تغیر و فنا کے ہر قانون سے بالاتر ہے۔ ایک بار پھر یہ قول مولانائے رومیؒ ؎

عشق بر مردہ نہ باشد پائیدار عشق را بر حیّ و بر قیوم دار

بس دل کا اٹکاؤ شرط ہے۔ امیر کو عشق اسی محبوب حقیقی سے تھا اور مرشد

کامل کے فیض و توجہ سے کہنا چاہئے کہ بچپن ہی سے پیدا ہوگیا تھا۔ ساری طلب و تمنا اسی عشق میں زیادتی کی تھی، دل میں بھی اور زبان پر بھی۔ ان کے کوئے بتاں سے مقصود و مراد شہر کا کوئی محلہ یا بازار کا کوئی حصہ نہیں، بلکہ حسن مطلق کی تجلیات گوناگوں ہیں۔ انھیں حسین و جمیل تجلیات میں وہ گم ہوا اور انھیں میں ضم ہو جانے کی دعا اپنے حق میں زاہد سے بھی کرا رہے ہیں ؎

کہ آں آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادا

رحمت ہو ان کی روح پاک پر۔ بزم سخن میں امیر بن کر رہے۔ اور اقلیم تصوف و معرفت میں خسرو بن کر چمکے۔ زبان پر وہ قدرت کہ ایران کے اہل زبان ان کی فارسیت کے قائل۔ اور سلوک و فقر میں وہ مرتبہ کہ جو تذکرہ صوفیہ و سالکین ان کے نام نامی سے خالی وہ خود ناقص و ناتمام۔

---

(۱۸) کربلا اور اسلام[۱]

چشم تصور کے سامنے تاریخ عرب کے ایک قدیم بہت قدیم دَور کو لایئے۔ تاریخ اسلام سے بھی قدیم تر۔ (اسمٰعیل[۱] پیمبر[۲] کی نسل میں ایک زبردست مرکزی شخصیت عبد مناف کی ہے۔ چار بیٹوں کے باپ۔ ان چار میں دو[۲] کے درمیان نفاق و شقاق کی بنیاد پڑی۔ بڑے کا نام عبد شمس۔ چھوٹے کا نام ہاشم۔ اور باپ کی وفات کے بعد مخالفت کی آگ اور بڑھتی اور پھیلتی ہی گئی ——— بھائی بھائی کی مخالفت معاذ اللہ! عبد شمس نے کہنا چاہئے کہ قابیل کی سنگدلی کی داستان زندہ کردی! ضد یہ تھی کہ ہاشم نے چھوٹے ہو کر اپنی صلاحیت کے زور اور اپنی بے پناہ داد و دہش سے قوم کی سرداری اور قبیلہ کی پیشوائی کیسے حاصل کرلی۔ فرد جرم کی دوسری دفعہ یہ تھی کہ ہاشم نے روم کے قیصر اور اور حبشہ کے نجاشی سے مل ملا کر اور ان کے درباروں میں رسوخ پیدا کر کے تجارتی مراعات عربوں کے لئے کیوں حاصل کرلیں۔ اور تیسرا عنوان یہ تھا

---

[۱] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ ۵ دسمبر ۱۹۴۶ء (۱۰ محرم ۱۳۶۶ھ) کی شام کو۔

وقت: ۱۰ منٹ۔

خانہ کعبہ کے انتظامات قوم نے اس کے سپرد کیسے کر دیئے!۔

عرب کا کینہ، شتر کینہ کی طرح ضرب المثل شہرت و اہمیت رکھتا ہے جب چھڑتی تو بس نسلوں تک چھڑی ہی رہتی۔ عبد شمس کی وفات پر جب ان کے دلبند امیّہ جانشین ہوئے تو ہاشم کے ساتھ یہ عداوت بھی ورثہ میں پائی۔ نوبت یہ پہونچی کہ ایک دن بھتیجے نے چچا کو چیلنج ہی دیدیا۔ اور باقاعدہ مناظرہ و مقابلہ کی ٹھہر گئی۔ جج یا ثالث قبیلۂ خزاعہ کے ایک کاہن تھے فیصلہ امیّہ کے خلاف ہوا۔ چلئے اس دن سے عداوت کی جڑ اور مضبوط ہو گئی اور امیّہ کو شرائط کے مطابق نہ صرف پچاس اعلیٰ درجہ کے اونٹ ہارنے پڑے بلکہ خود بھی دس سال کے لئے جلاوطن ہو کر شام کو جانا پڑا۔۔۔ انھیں ہاشم کی چوتھی پشت میں ولادت باسعادت ہمارے اور عرب کے سردار، سرور کائنات صلعم کی ہوئی اور امیّہ کے صلب سے جو سلسلہ چلا، اس میں دو پشتوں کے بعد تیسری پشت میں امیر معاویہ پیدا ہوئے۔

رنجشیں اور عداوتیں ختم نہیں ہوئیں۔ چلتی رہیں اور بڑھتی رہیں۔ رسول ہاشمی کی شخصیت کا یہ اعجاز تھا کہ یہ طوفان ذری کی ذری رُکا اور بنی امیّہ اور بنی ہاشم سب نے آپ کی سرداری و پیشوائی کے آگے گردن جھکا دی بنی ہاشم نے عموماً اول اول اور بہ شوق اور بنی امیّہ نے عموماً رُک رُک کر اور آپ صلعم کی فتوحات مشاہدہ کر لینے کے بعد۔ اس آفتاب عالمتاب صلعم کا اُفق شہود سے غائب ہونا تھا کہ وہی تاریکیاں پھر بڑھیں اور اُبھریں اور اب اور زیادہ شد و مد سے ۔۔۔ تاریخ کے راوی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلعم کی زندگی ہی میں خاندان ہاشم کے ایک زبردست

حریف نے کھلم کھلا کہہ ڈالا تھا کہ "بنی ہاشم نے تجارت میں ہم سے بڑھنا چاہا ہم نے مقابلہ کیا۔ شجاعت میں نام پیدا کرنا چاہا ہم نے اپنی جانوں کی بازی لگادی۔ اب یہ محمدؐ نے نبوت کا جو دعویٰ شروع کر دیا ہے اس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔"

خلافت یا جانشینیِ رسولؐ کے وقت قریب تھا کہ دبے دبائے فتنے پھر سے بھڑک اٹھیں۔ بزرگان قریش کی حکمت و دانائی کام آئی، اور خلافت اول و دوم دونوں کے موقع پر انتخاب ایسے حضرات کا ہوا، جو قریشی ہونے کے باوجود نہ ہاشمی تھے نہ اموی۔ تیسری خلافت کے موقع پر میدان انتخاب تنگ ہو کر ایک ہاشمی اور ایک اموی کے درمیان رہ گیا اور دونوں کے تعلقات قرابت بھی رسول اللہ صلعم سے تقریباً یکساں۔ رسولؐ کے عہد سے اب بُعد بھی ۱۲ سال کا ہو چکا تھا۔ لیکن علی مرتضیٰ کے صبر تحمل تسلیم و رضا نے اب کی بھی جو بات بگڑ چلی تھی اُسے بنائے رکھا۔ اس پر بھی جو واقعات اور حادثات پے در پے خلافت راشدہ کے دور سوم و چہارم میں پیش آتے رہے خواہ ان کے اسباب کچھ بھی ہوں، اور ذمہ داری جس حد تک جس فریق پر بھی آتی ہو، بہر حال ان سے یہ فتنہ خوب اچھی طرح پرورش پاتا رہا اور اس عہد کے بعد تو یہ قابو سے بالکل ہی باہر ہو گیا۔

اب ہجرت کے ۲۰ء و ۲۱ء میں آجایئے۔ حکومت و حاکمیت کو خاندان امیہ کے ہاتھ میں آئے ہوئے سالہا سال ہو چکے ہیں۔ اور وسیع و عریض دنیائے اسلام اب دو مستقل کیمپوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک کا مرکز عراق اور اس کا شہر کوفہ، دوسرے کا مستقر شام اور اس کا شہر دمشق۔ صوبہ حجاز اور ارض حرمین بین بین میں۔ تخت حکومت پر قابض

ایک ایسا شخص جس کا ماضی جو کچھ بھی رہا ہو۔ حال و مستقبل دونوں اخلاقی اعتبار سے دوست و دشمن سب کے نزدیک ایک ناقابل اطمینان اور جس کی زندگی کو ایک معیاری جانشینِ رسولؐ کی زندگی سے نسبت دور کی بھی نہیں۔ عین اسی فضا اور اسی ماحول میں ایک قافلہ ارض حجاز سے سرزمین عراق کی طرف سفر کرتا نظر آتا ہے۔ سالارِ قافلہ بنی ہاشم کے سردار اعظم، رسولؐ کے محبوب نواسہ اور نور عین۔ خود سے نہیں آرہے ہیں۔ اہل عراق کی مسلسل درخواستوں پر متواتر عرضداشتوں پر تشریف لا رہے ہیں۔ قافلہ فوجیوں کا لشکر نہیں اور نہ ساتھ سامانِ جنگ۔ افراد قافلہ، سالار قافلہ کے خاندان کی بیویاں، کچھ قریب کے اعزّاء، اور کچھ مخلص رفیق اور جانثار خادم۔ مرد چھوٹے بڑے سب ملا کر ۷۲۔ حکومت وقت کے پیادے اور سوار راہ میں راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک عہد اطاعت نہ کرو گے، آگے قدم اُٹھانے کی اجازت نہیں، رسول کے نواسہ جواب دیتے ہیں کہ "جنگ و محاربہ میرا ہرگز مقصود نہیں۔ کوئی جنگجو حریف بھلا اس بے سرو سامانی کے ساتھ بھی گھر سے نکلتا ہے؟ میں تو صرف اس غیر عادلہ اور فاسقانہ نظام حکومت کی اطاعت اور تسلیم و قبول سے معذور رہوں۔ اب ممکن تین صورتیں ہیں۔ یا تو اپنے بادشاہ کے پاس لے چلو۔ میں اس سے سوال و جواب کر لوں گا۔ یہ نہیں منظور ہے تو مجھے ارض حجاز واپس جانے دو، میں سیاست سے الگ گوشہ نشین ہو کر عبادت اور دینی مشغلوں میں مصروف رہوں گا۔ اور یہ بھی گوارا نہ ہو، تو مجھے مملکت اسلامی کی سرحدوں سے چلا جانے دو۔ میں منکروں اور کافروں سے مقابلہ و جہاد کرتا رہوں گا" ——— دنیا کی تاریخ میں اس سے زیادہ

مصالحانہ و مصلحانہ، منصفانہ پیام کسی ایک فریق نے کسی دوسرے فریق کو کیوں دیا ہوگا؟

حکومت کے ایک بڑے نمائندہ، صوبہ عراق کے اموی گورنر نے (جو اپنی بدذاتی کے لئے ہی مشہور تھا) شریفانہ شرائط کو یکلخت ٹھکرا دیا ——— قوت کا نشہ بھی سخت نشہ ہوتا ہے اور پھر یہاں تو نسلی عصبیت اور خاندانی منافرت کا جذبہ بھی پوری طرح کارفرما تھا ——— ان بے بصیرتوں نے حق و باطل کے سوال پر خالی الذہن ہو کر غور ہی کب کیا؟ انھوں نے تو صرف یہ دیکھا کہ پشتینی دشمنوں ہاشمیوں کا مٹھی بھر گروہ اتفاق سے ہاتھ لگ گیا ہے اور ان کا سب سے بڑا لیڈر بھی ان کے ساتھ ہے۔ چلو موقع اچھا ہے خطرہ کو ہمیشہ کے لئے ختم نہ کر دو ——— بہرحال جنگ کا اگر اسے جنگ کہا جا سکے نتیجہ وہی نکلا، جو سیکڑوں ہزاروں کے مجمع میں گنتی کے چند افراد کے گھر جانے کا ہمیشہ ہی اس آب و گل کی دنیا میں نکلا کرتا ہے۔ واقعات، دردناک واقعات، آپ سب کے علم میں ہیں۔ نہ ان کے دہرانے کی حاجت نہ وقت میں اتنی گنجائش۔ کام کی بات ہمارے آپ کے سب کے لیے تیرہ سو سال کی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی یہ ہے کہ

(۱) مومنین متقین کے اس سردار نے جنگ و محاربہ میں اپنی طرف سے کوئی پیش قدمی یا عجلت ہرگز نہیں کی۔ بلکہ ہر ممکن کوشش اس کی کی، کہ اپنی خودداری کے تحفظ کے ساتھ فضا امن و آشتی ہی کی قائم رہے۔ سیاسی گوشہ نشینی وطن سے ہجرت، یہ سب چیزیں گوارا کر لیں پر حتی الامکان کشت و خون کی راہ کو قبول نہ کیا ——— صحیح و اصلی شجاعت کے معنی بھی یہی ہیں۔

(۲) جب جنگ کے سوا چارہ نہ رہا، اور شمشیر زنی ناگزیر ہو گئی تو

پھر وہ داد شجاعت دی کہ دوست تو دوست، دشمن اور مخالف بھی اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے۔ حق پر جان دینا گوارا کر لیا، پر حکومتِ غیر عادلہ کی اطاعت قبول نہ کیا ــــــ توکل، ایثار، استقامت کے صحیح سبق دینے والی درسگاہ میدان کربلا ہے۔

حادثہ نے تاریخ امت پر جو اثرات ڈالے، ان کی تفصیل تو ایک لمبے وقت کی محتاج ہے۔ مختصر لفظوں میں بس اتنا سُن لیجئے کہ بنی امیّہ کی حکومت جس کی بنیادیں یوں بھی اپنی زیادتیوں کے باعث چند روز بعد ہل جانے والی تھیں، اس کے زوال و فنا کی رفتار اس حادثہ سے اور زیادہ تیز ہو گئی۔ اور دنیائے اسلام پر یہ روشن ہو گیا کہ کوئی کلمہ گو اگر کسی طریقہ سے تخت حکومت تک پہونچ جائے تو یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حق پر ہے اور اس کی حکومت واجب الاطاعت بھی ہے۔

سیدنا حضرت حسین رضؓ نے اگر از خود کہیں حملہ کر دیا ہوتا تو مخالفین کو یقیناً یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ فوج کشی، ملک گیری اور حصول سلطنت کے اغراض سے ہوئی اور اگر کہیں حکومت فاسقہ کے مطالبۂ بیعت کو مان لیا ہوتا تو دوسری طرف امت کے لئے ایک سند اور نظیر قائم ہو جاتی کہ مرد حق پرست کے لیے باطل کی اطاعت اور فسق سے مفاہمت جائز و درست ہے ــــــ حسین رضؓ نے افراط و تفریط دونوں سے بچ کر وہ راستہ اختیار کیا، جو عین عدل و اعتدال کی راہ تھا، اُسوۂ حسینی ہمیشہ کے لئے امت کے حق میں دلیل راہ بن گیا۔ اور سنہ اسلامی کے پہلے عشرہ نے تقویم امت میں رُشد و ہدایت کے نمونہ کے طور پر ایک مستقل مقام حاصل کر لیا ــــــ ایک کہنے والے نے یہ بھی تو کہہ دیا تھا کہ حسن رضؓ اور حسین رضؓ دونوں جوانانِ جنت کے سردار

ہوں گے اور اس کہنے والے کی زبان ہمیشہ سچ ہی کھلتی تھی۔ پھر جوانانِ جنّت کی سرداری کیا بغیر اتنی عظیم الشان قربانی کے، اتنے بڑے جہاد نفس کے، بے مثال ایثار و بے نفسی کے کیا یوں ہی مل جاتی؟
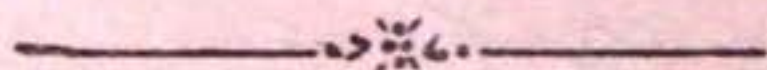
(۱۹) عید کی خوشی

یہ آج بات کیا ہے کہ مسلمانوں کے محلوں میں گھر گھر خوشی نظر آرہی ہے، بوڑھے، بچے، عورت، مرد، غریب، امیر، جس کو دیکھئے اس کا چہرہ کھِلا جارہا ہے۔ یہ اس سے گلے مل رہا ہے، وہ اسے ہنستے ہوئے چہرہ سے سلام کررہا ہے۔ کوئی نہا دھو رہا ہے، کوئی نئے نئے کپڑے نکال کر پہن رہا ہے۔ ٹھاٹھ اکیلے امیروں کے نہیں، غریبوں کے بھی ہو رہے ہیں۔ آج مسلمانوں کے یہاں عید ہے۔ روزہ کی پابندیاں کوئی معمولی پابندیاں ہیں؟ صبح منھ اندھیرے سے لے کر سورج ڈوب جانے تک نہ کھایئے نہ پیجئے، گرمی کی تپش ہو، برسات کی اُمس ہو، جاڑے کی ٹھنڈ، بھوک لگے، پیاس سے زبان خشک ہو، ہونٹوں پر پپڑیاں حلق میں کانٹے پڑ جائیں اور دن چاہے ۱۰ گھنٹے کا ہو یا ۱۴ گھنٹے کا، یہاں حلق سے نہ چائے کے گھونٹ اُترنے پائیں گے نہ پانی کے قطرے! —— اطاعت کہئے یا "ڈسپلن" اس کے معنی ہی یہی ہیں۔ اور پھر یہ کڑی

لہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ اگست ۱۹۴۷ء کی شام کو۔ وقت: ۱۰ منٹ۔

آزمائش، ایک دن، دو دن کے لئے نہیں۔ لگاتار پورے تیس دن کی!!
اچھے اچھے ہمت والے بول جاتے ہیں اور جی ہی جی میں کہنے لگتے ہیں کہ
عید کل کے آتے آج ہی آجاتی۔

ذہن و شکم کی اطاعت، روحانی، اخلاقی، طبی فائدوں کی خاطر دوسری چیز ہے
اور بھوک پیاس کی طبعی طلب اپنی جگہ پر ——— ۲۹ر کی شام ہوئی کہ سب کی نظریں
آسمان کی طرف اُٹھ گئیں۔ بوڑھے، بچے، عالم اور عامی، زاہد اور رند، عید
کے چاند کا اشتیاق اور انتظار کس کو نہیں ہوتا؟

چاند ۲۹ر کا ہوا یا ۳۰ر کا، بہر حال ہوا اور ادھر گھر گھر خوشی کی لہر دوڑ
گئی۔ بچے مست ہو کر اُچھلنے کودنے لگے۔ کسی کو گولے پٹاخے چھوڑنے کی سوجھی۔
پڑھے لکھے ثقہ لوگوں نے چاند کو دیکھ کر چاند کے پروردگار سے دعا کی کہ اے
خدا اس چاند کا دیدار ہم سب کو مبارک کر۔ آپس میں مبارک سلامت
ہونے لگی۔

آج کی رات آنکھوں میں کٹی۔ رت جگا بغیر کڑھائی اور گلگلوں کے
ہو گیا۔ بچوں کی پلک تو مارے خوشی کے نہ جھپکی۔ گھر کی عورتوں کو سلائی کے
کام نے مہلت نہ دی۔ پھر گھر کا رکھ اُٹھاؤ، صبح کے لئے دودھ، شکر،
سوئیوں کا انتظام، مردوں نے رات عبادت میں کاٹی۔ رمضان ہی کی راتوں
کی طرح آج کی رات بھی بڑی بابرکت رات ہے خوب خوب دعائیں مانگیں،
اپنے لئے، اپنے والوں کے لئے، دوستوں کے لئے، عزیزوں کے لئے
نفلیں پڑھیں۔

غریبوں، مفلسوں کے ہاں بھی خوشی کچھ ایسی کم نہیں۔ کم از کم فاقہ تو
نہ ہوگا۔ روزہ کی عبادت محض بدنی نہیں۔ یہ بھی حکم ہے کہ مہینہ بھر جی کھول کر

غریبوں، ناداروں کو کھلاؤ پلاؤ۔ اور عید کے لئے تو تاکیدی حکم ہے کہ مالی امداد اپنے غریب پڑوسیوں کی ضرور کرو۔ بغیر اس کے روزوں میں جلا اور پاکیزگی پیدا ہی نہ ہونے پائے گی۔ بلکہ بہتوں کے روزے تو آج یوں ہی معلق رہ جائیں گے جب تک اس نادار فنڈ میں کچھ دے دلا نہ دیا جائے۔ امیر قورمہ کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کرے گا تو مفلس کو بھی آج پیٹ بھر کی روٹی تو ضرور ہی نصیب ہو جائے گی۔

صبح ہوئی اور نماز عید کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ نماز عید روز کی پنج وقتہ نماز کے علاوہ ایک اور نماز کا اضافہ ہے۔ دن نکلتے ہی شہر کے باہر پڑھی جائے گی۔ اور چاہیے تو یہی کہ بڑے اور چھوٹے مل کر وہیں پڑھیں۔ جوق در جوق گروہ گروہ سب چل تو اسی طرف رہے ہیں۔ نہائے دھوئے ہوئے جسم کو آلائشوں سے پاک کئے ہوئے اور روح کی پاکیزگی کے لئے خدائے پاک کا نام جپتے ہوئے، آہستہ بھی اور بہ آواز بلند بھی کوئی موٹر پہ اور کوئی پیدل، کوئی سائیکل پر، کوئی یکہ پر، تانگہ پر، بیل گاڑی پر مگر نعرہ ایک ہی سب کی زبان پر۔

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد۔ بڑائی آپ میں ہے صرف آپ میں ہے ہم میں کہاں، آپ کے بندے میں کہاں، بڑے صرف آپ ہیں کوئی آپ کی ذات میں شریک نہ آپ کی صفات میں۔ بڑے صرف آپ، بڑائی صرف آپ کا حصّہ۔ ہر طرح کی مدح و توصیف کے حقدار صرف آپ!—— نہ راگ نہ رنگ نہ کوئی باجہ نہ تماشہ، بس ایک ہی دھن سب پر سوار۔

نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو سب ایک۔ نہ کوئی لارڈ نہ کوئی گورنر،

نہ کوئی حاکم نہ کوئی محکوم۔ جج صاحب کے پاس ان کا چپراسی کھڑا ہوا اور راجہ صاحب کے مونڈھے سے مونڈھا ملائے ہوئے ان کا پنکھا قلی! خیر یہ منظر تو کم وبیش مسجد کی ہر جماعت میں نظر آتا رہتا ہے۔ لیکن عیدگاہ میں ایک عظیم الشان پیمانے پر یہ منظر مساوات اپنے پرائے سب ہی کی آنکھوں میں سمایا جاتا ہے اور سب کے دلوں میں گھر کر جاتا ہے۔

نماز کے بعد خطبہ اور اس میں بھی نصیحت کی باتیں بیان ہوئیں، نماز و خطبے کے بعد امام صاحب نے لمبی چوڑی دعا دیر تک مانگی۔ اپنی ذات کے لئے نہیں دنیا کے کل مسلمانوں کے لئے۔ اب سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں۔ ہاتھ ملا رہے ہیں۔ گویا کہ دلوں کے ملے رہنے جڑے رہنے کی ایک شان مادّی اور محسوس پیش کر رہے ہیں۔ واپس ہوئے تو پھر اسی شان سے خدا کی بڑائی کا کلمہ پڑھتے پڑھاتے اپنے اپنے گھر سے شیر خرما پی پلا کر گئے تھے۔ اب لوٹ کر آئے ہیں تو خود پی رہے ہیں اور دوسروں کو اپنے ہاں پلا رہے ہیں۔ پیئیں گے آخر کہاں تک۔ یہ کہئے کہ منھ جھٹال رہے ہیں۔

دوپہر ہوئی اور عید کی ملاقات کے لئے سب کے یہاں کا گشت شروع ہوا۔ جن سے ملاقات کی نوبت سال سال بھر نہیں آنے پاتی آج ان سے بھی ملا جائے گا اور دلوں کی کدورت دور کی جائے گی۔ گشت میں تخصیص نہ بڑے کی ہوگی نہ چھوٹے کی۔ اور خیر یہ تو پھر اپنے ہیں۔ آج تو تفریق اپنے پرائے کی بھی نہیں۔ آج مسلمان جب ملاقات کے گشت پر نکلتے ہیں تو اپنے ہندو پڑوسیوں، ہندو محلہ والوں، ہندو بستی والوں کو نہیں بھولتے اور وہ لوگ بھی جیسے اس کی آس مدت سے لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ملنا ملانا

دل کھول کر ہوتا ہے ۔ اپنے قصبے میں دستور یہ دیکھا اور شاید یہی دستور ہر قصبے اور بہت سے شہروں میں ہے کہ عید کے دن کھاتے پیتے ہندو اپنے گھروں پر عطر اور الائچی اور پان لئے بیٹھے رہتے ہیں کہ آج مسلمان بھائی آتے ہوں گے اور ان کی خاطریں کی جائیں گی (اور ہولی کے دن یہی صورت مسلمان کرتے ہیں)۔ سال میں کم از کم یہ ایک دن تو ضرور ایسا آتا ہے کہ جب مسلمان اپنی طرف سے محبت کی صلائے عام دیتا ہے۔

(۲۰) ولادتِ باسعادت[1]

آگے کچھ سُننے سُنانے سے قبل ذہن کے سامنے نقشہ، تاریخ کی بڑی بڑی ضخیم و مستند کتابوں کی مدد سے، چھٹی صدی عیسوی کے آخر اور ساتویں صدی عیسوی کے شروع کی دنیا کا، خصوصاً مہذب و متمدن دنیا کا، لے آیئے۔ دنیا کی زبردست اور نامور طاقتیں اُس وقت دو تھیں، جن کے نام سے سب تھراتے تھے، اور جن کا لوہا مشرق و مغرب مانے ہوئے تھے۔ مغرب میں رومن امپائر یا شہنشاہیٔ روم، اور مشرق میں پرشین امپائر یا شہنشاہیٔ ایران۔ دونوں بڑی بڑی فوجوں اور لشکروں کے مالک، دونوں میں زر و دولت کی افراط اور دونوں کا تمدن عروج پر۔ لیکن دونوں کی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ۔ عیش و عشرت نے مردانگی کی جڑیں کھوکھلی کر ڈالی تھیں اور روح و قلب کے "روگ ہر قسم کے پھیلے ہوئے" ـــــ انسان کا رشتہ اپنے خالق سے بالکل ٹوٹا ہوا، توحید کا چراغ گویا بالکل بجھا ہوا ـــــ

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۔ ۱۹ / اپریل ۱۹۴۶ء (۱۲ / ربیع الاول ۱۳۶۵ھ) کی شام کو۔ وقت ۱۵ منٹ۔

اور یہی حال کم و بیش ساری دنیا کا۔ تفصیل کا وقت کہاں، ورنہ ہندوستان چین، مصر وغیرہ ایک ایک ملک کا نام لے کر اس وقت کے اخلاقی زوال کی تصویر آپ کے سامنے پیش کر دی جاتی۔

اس وبائے عام میں ملکِ عرب کا نمبر خاص۔ شاعری کے آرٹ میں یہ قوم یقیناً طاق اور تجارت کے کاروبار میں بھی بہت ممتاز ــــ چند اور اخلاقی جوہر بھی ان کے اندر خوب چمکے ہوئے، بہادری اور سپہگری، فیاضی، مہمان نوازی میں ان کا سکہ قرب و جوار ہی میں نہیں، دور دور تک بیٹھا ہوا۔ لیکن اس سے آگے چلئے تو یہ لوگ بالکل کورے۔ آج اسے لوٹ لیا، کل اسے ختم کر دیا، بے حیائی فیشن میں داخل اور بے ستری جزوِ عبادت۔ شراب کی محفل جمی تو شام کی صبح ہو گئی، جوئے کی بازی لگی تو جسم سے کپڑے تک اتر گئے، اور خون کے انتقام در انتقام کا سلسلہ جو چلا تو کہنا چاہئے کہ صدی کی چھٹی ہو گئی، عمریں ختم ہو گئیں، پشتیں گذر گئیں اور جھگڑا چکائے نہیں چکتا ــــ تو یہ تھا چھٹی صدی عیسوی کی آخری تہائی کا ملک عرب، جس کے مشہور ترین اور مقدس ترین شہر مکہ میں ۵۷۰ء میں ایک روز صبح صادق کے وقت قوم کے شریف ترین گھرانے میں ایک جیتا جاگتا چاند عالمِ ظہور میں آیا، جس کی نورانیت سے، کہنے والے کہتے ہیں کہ اُن کے گھر کے در و دیوار تک جگ مگ کرنے لگے ــــ زچہ خانہ کے مادی حدود کی بساط ہی کیا، یہ نورانیت تو اس غضب کی تھی کہ مشرق و مغرب کے سرے اس سے جگمگا اٹھنے والے تھے۔

عرب کی جغرافیہ کا خاکہ تو آپ کے ذہن میں ہو ہی گا، طول البلد ۱۲ اور ۳۲، عرض البلد ۳۵ اور ۶۰۔ ایک طرف مصر اور حبشہ اور طرابلس اور

سارا براعظم افریقہ، دوسری طرف ملک روم و شام و فلسطین اور سارا یورپ۔ تیسری جانب عراق اور ایران اور سارا ایشیا، اور چوتھی سمت میں سمندر ہی سمندر۔ گویا معمورۂ عالم، خصوصاً اس وقت کی دنیائے مہذب کا عین چوراہہ! اور پھر جو تجارتی شاہراہ مشرق کو مغرب سے ملا رہی تھی اور بحر ہند و خلیج فارس کے تجارتی مال کو خشکی کے راستہ مصر و روم و شام تک پہونچا رہی تھی، وہ بحر احمر کے برابر برابر گویا ایک خطِ مستقیم بناتی ہوئی ٹھیک اسی عرب ہی کے مغربی کنارے پر تو تھی!

تاریخ اور جغرافیہ، دیکھئے دونوں کی شہادت کیا گذری ہے۔ یہی نہ کہ اکیلے عرب ہی کی نہیں، دنیا کی اصلاح کے لئے، اس سے بڑھ کر ضروری وقت و زمانہ اور کون ہو سکتا تھا اور مقام اس کے لئے عرب سے موزوں تر کون سا ہو سکتا تھا ـــــ زمان و مکان دونوں کے لحاظ سے ولادت ایسی "با سعادت" اور کون سی ہو گی؟ والد ماجد کا نام عبد اللہ، توحید و عبودیت کی طرف کتنا صاف اشارہ۔ والدہ ماجدہ بی بی آمنہ، امن و امان کے حق میں ایک مستقل فالِ نیک! ـــــ آنکھ یتیمی میں کھلی ـــــ والد ماجد نورِ عین کے دیدارِ جمال سے قبل ہی سفرِ آخرت پر روانہ ہو چکے تھے۔ جس کو سارے عالم کا سہارا بنایا جانے والا تھا حق تھا کہ قدرت اُسے وجود میں بغیر ظاہری سہاروں کے لائے اور اس کا سہارا روزِ ازل سے بجز ذاتِ حق کے اور کوئی ساجھی نہ رکھے!

نامِ نامی دادا عبد المطلب نے "محمد" رکھا۔ لفظی معنی "بہت حمد کئے گئے" کے۔ ذات ستودہ صفات کے لئے اسم بامسمّٰی۔ دوسرا نام "احمد" پڑا۔ جس کی زندگی حمد میں کٹی اور جسے اُٹھنا بھی مقامِ حمد میں

ہے، اُس کے لئے اس سے بہتر نام اور ہو ہی کیا سکتا تھا! پلے، بڑھے، کھیلے، چلے پھرے، ملے جُلے۔ بچپن یوں گذرا کہ خود معصومیت اس بچپن پر فخر کرنے لگی۔ جوان ہوئے تو نیکی اور پارسائی، طاعتِ حق اور خدمتِ خلق بلائیں لینے لگیں۔ جوانی یوں بھی دیوانی ہوتی ہے، اور پھر ایسے ملک و قوم میں جہاں عیش پرستی اور لذّت کوشی کی ہر راہ کھُلی ہوئی۔ قدم کی ہر لغزشِ مستانہ پر رواج اور فیشن کی مہر لگی ہوئی۔ اس ماحول میں اور سِن و سال میں، محلہ اور بستی والوں نے، کنبہ اور قبیلہ والوں نے لقب دیا بھی تو کیا؟ "امین"! امین کا، لفظ بڑا وسیع اور جامع ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ VIRTUOUS ہی سے کیا جا سکتا ہے یعنی محمدؐ دیانتدار بھی ہیں اور راست باز بھی، نظریں نیچی رکھنے والے بھی اور سب کی خدمت کرنے والے بھی ـــــ کتنے ایسے ہیں، جن کی قسمت میں ہر وقت دیکھنے والوں کی زبان سے یہ شہادت آتی ہے!

لڑکپن بھر گلّہ بانی کی ـــــ جس کے نصیب میں آگے چل کر قوموں اور اُمتوں کا گلّہ بان ہونا تھا، اُس کے لئے کتنی اچھی تعلیم! ـــــ جوان ہوئے تو تجارت اختیار کی ـــــ جس کا کام آگے بڑھ کر جنت کے تمسکات (SHARE CERTIFICATES) ہلکے پھلکے داموں خرید وانا ہونا تھا، اس کے لئے کتنا موزوں اور پُر معنی پیشہ! امانت و دیانت اور کاروبار میں مہارت دیکھ ایک دولت مند بیوہ نے شادی کی درخواست از خود کی اور ۲۵ سال کے سِن میں اس جوانِ رعنا کی خانگی زندگی بھی شروع ہو گئی۔ سِن کے چالیسویں سال میں تھے کہ مرتبۂ نبوت سے سرفراز ہوئے۔ ساری تیاریاں اسی لئے تھیں اور ۲۳ سال تک اپنے خالق و

مالک کا پیام بندوں کو سُناتے رہے۔ نکاح کئی فرمائے۔ اولادیں بھی متعدد ہوئیں۔ لڑائیاں بار بار سخت اور خونریز اپنے ہموطنوں اور ہم قوموں سے لڑنا پڑیں ہمسایہ ملکوں سے معاہدے بھی کئے۔ ملک کے انتظام .... ہر طرح کے فرمائے۔ دیوانی فوجداری قانونی فیصلے ہر قسم کے کرنے پڑے۔ غیر مسلم تاجروں کو نامۂ پیام رکھا۔ بے شمار نمازیں پڑھیں اور پڑھائیں۔ خطبہ یا برجستہ تقریریں۔ خدا معلوم کتنی کر ڈالیں۔ غرض یہ کہ دنیا کو ہر ہر پہلو پر خوب برتا۔ لیکن دنیا میں ایک بار بھی نہ پڑے ___ جیسے غوطہ خور نے سمندر میں گر کر غوطہ لگایا اور جسم کا ایک رویاں بھی بھیگنے نہ پایا ___ اور جب ۶۳ سال کی عمر شریف میں جون ۶۳۲ء میں اس فانی دنیا کو چھوڑا، تو دل میں تمنا اپنے رفیقِ اعلیٰ کے دیدار کی بسی ہوئی تھی اور پاک اور معصوم ہونٹوں سے آواز اَللّٰھم بالرفیق الاعلیٰ کی چلی آرہی تھی!

تعلیم یہ لائے کہ اپنی عقلوں اور ذہنوں کو مادیات کے جنجال میں نہ پھنساؤ۔ اسباب ظاہری و قریبی کے دھوکے میں نہ آؤ۔ ان سے کام یقیناً لو اور پوری طرح لو۔ لیکن اصلی سہارا اور حقیقی بھروسہ ایک اَن دیکھی ذات ہی کا رکھو۔ وہی سب کا پیدا کرنے والا، وہی سب کو پالنے جلانے والا اور وہی سب کو آخر میں مارنے اُٹھانے والا ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہ ذات میں نہ صفات میں ___ زندگی کے چھوٹے بڑے ایک ایک عمل میں اپنی ذمہ داری محسوس کرو۔ اور مادی و جسمانی زندگی کو سلسلہ ہستی کا ایک جزو اور بہت ہی محدود جزو سمجھو۔ تنگ نظری سے کام لے کر اسی کو کل سمجھ لینے کے دھوکے میں نہ پڑو۔ اس "آج" کا عنقریب "کل" ہونے والا ہے۔ ہر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو کر رہے گا۔ ساری تیاری اس یوم حساب

کے لئے رکھو۔

قانون یہ بنایا کہ کوئی کسی حال میں کسی پر ظلم نہ کرے۔ بڑائی اور چھٹائی اس عالمِ آب وگِل کا بنیادی قانون ہے۔ کوئی امیر رہے گا، کوئی غریب۔ لیکن بڑے کو چھوٹے کے دبانے کا اور امیر کو غریب کے پیسنے کا، حاکم کو محکوم کے ستانے کا قطعاً کوئی حق نہیں۔ میاں اور بیوی، بادشاہ اور رعایا، زردار و نادار، ادائے حقوق کے لحاظ سے اللہ کی عدالت میں سب بالکل برابر ہیں دھیان اپنے فرائض کا رکھو۔ اپنی ذمہ داریوں کو ایک دوسرے کے حق میں ادا کرو۔ مطالباتِ حقوق کا نام لے کر غل غباڑہ نہ کرو۔ دنیا کو ہنگامہ و فساد کے تہلکہ میں نہ ڈالو۔ تلوار ہاتھ میں اُٹھاؤ بھی تو دنیا میں امن قائم کرنے کو، اللہ کی حکومت کا سکّہ از سرِ نو چلانے کو۔ سود کا، رشوت کا، خیانت کا ایک ایک پیسہ حرام سمجھو۔ بے حیائیوں کے قریب نہ جاؤ۔ ننگے ناچ کی قدردانی نہ کرو۔ نشہ کی چیزوں کو ہاتھ بھی نہ لگاؤ۔ ترکہ سب وارثوں کو اُن کے حصۂ رسدی کے مطابق تقسیم کرو۔ یہ نہ ہو کہ سب کچھ بڑا لڑکا پا گیا اور دوسرے لڑکے لڑکیاں منہ دیکھتی ہی رہ گئیں۔ جوئے کی کمائی چوری کے مال کی طرح گندی سمجھے رہو۔ بیگانی عورت کی طرف نظر بھی نہ اُٹھاؤ۔ ہاں جائز شادیاں اگر ضرورت یا مصلحت سمجھو تو ادائے حقوق کے ساتھ ایک سے زائد بھی کر سکتے ہو۔

غرض ان ساری ہدایتوں کو، اپنے پروردگار سے سیکھ کر جب وہ رہبرِ اعظم اس دنیا سے رخصت ہوا تو وہ دنیا کے ہاتھ میں ایک مکمل ہدایت نامہ اور جامع و مفصّل دستور العمل دے کر گیا۔ اور اُس کی

یہ ساری تعلیمات محض لفظی نہ تھیں، وہ ان سب کی مشق سالہا سال تک اپنے سامنے کرا کر گیا ـــــ اُس کی قوم کے جاہلوں اور فاسقوں نے اُس کا پیچھا لیا اسے اپنے مشن کے تحفظ کے لئے مکۂ معظمہ سے جلاوطن ہو کر ڈھائی پونے تین سو میل کی منزلیں طے کر کے مدینہ جا بسنا پڑا تھا، اور بے رحمانہ سختیوں کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو اسے اور اُس کے وفادار ساتھیوں کو جھیلنا نہ پڑی ہو۔ ساری مشکلات پر وہ اپنی معجزانہ ہمت وتدبیر سے غالب آیا۔ ملکوتی اور لاہوتی قوتیں پہاڑوں کو اس کے سامنے پانی کرتی گئیں۔ اُس نے اپنے پیچھے اپنے شاگردوں کی ایک جماعت ایک لاکھ سے اوپر کوئی سوا لاکھ کی چھوڑی، اور عرب کے کوئی ۱۲ لاکھ مربع میل پر وہ اپنی عادلانہ حکومت کا نقش قائم کر گیا۔ اس کی ہمہ گیر، بے نظیر اور جمال وجلال اور کمال سب کی جامع شخصیت کے لئے ہم کو آپ کو نہیں یورپ کو آج تک اعتراف ہے کہ "وہ دنیا کے تمام انبیاء اور مذہبی شخصیتوں میں کامیاب ترین ثابت ہوئی۔" (The most succ-essful of all prophets and religious personalities) اس حوالہ کے لئے ملاحظہ کیجئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ۱۱ ویں ایڈیشن کی جلد ۱۵ صفحہ ۸۹۸، اور اس کے لائے ہوئے لاجواب اور بے مثال خدائی کلام کے لئے بھی آج اسی یورپ کو اقرار ہے کہ اس سے زیادہ کثیر الاشاعت دنیا کے پردہ پر کوئی کتاب نہیں۔ (The most widely read book in existence) اس حوالہ کے لئے ملاحظہ فرمایئے اسی انسائیکلوپیڈیا کے اسی ایڈیشن کی اسی جلد کا وہی صفحہ۔

یہ خراجِ عقیدت منکرین کی زبان سے کس کے حصّہ میں آیا ہے؟ اللّٰھم صل وسلم وبارک علیہ۔

---
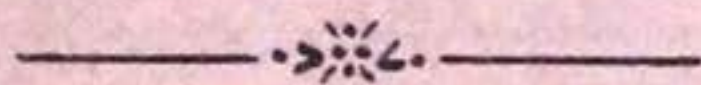
(۲۱) رحمت العالمین[1]

"میں شہادت دیتا ہوں کہ انسان انسان بھائی ہیں"۔ جس کے منہ سے یہ سندر بول نکلے تھے، آج اُس کی پیدائش کا دن ہے۔ اُسی نے آکر دنیا کو یہ پیغام دیا تھا۔ بتایا تھا کہ نسل کی، جلد کی، رنگ کی یا وطنی تقسیم کی بنا پر کسی سے جنگ کرنا یا کسی کو حقیر و ذلیل سمجھنا حماقت ہے۔ یہ ساری چیزیں غیر اختیاری ہیں۔ انسان کے کردار کا، اس کے شرف و عظمت کا ان سے کیا سروکار۔ اور اسی نے آکر یہ منادی کی تھی کہ اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ (مخلوق تو ساری اللہ کا کنبہ ہے)۔ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰہِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عِیَالِہٖ (تو مخلوق میں اللہ کی نظر میں محبوب ترین وہی ہے جو اس کنبہ کے ساتھ بہترین سلوک سے پیش آئے)۔ مہر و محبت کے اس پیامبر کو، شفقت و الفت، ہمدردی و انسانیت کے اس سچے پیامِ رساں کو "رحمتِ عالم" نہ کہیے تو آخر کہیے کیا؟

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ ۱۳ر جنوری ۱۹۳۹ء (۱۲ ربیع الاول ۱۳۶۸ھ) کی شام کو۔ وقت: ۱۰ منٹ۔

آج اس کی پیدائش کا دن ہے، جس نے اپنے پیروؤں کو ہدایت کی تھی کہ حکمت و دانش تو تمہاری ہی کھوئی ہوئی چیز ہے، تو تم جہاں کہیں بھی پاؤ اپنی ہی چیز سمجھ کر حاصل کر لو اور اس وہم میں نہ پڑے رہو کہ یہ غیروں کی ہے، اسے ہم ہاتھ کیسے لگائیں۔ اور ہاں اُسی نے یہ ہدایت بھی تو کی ہے کہ علم و دانش کی تحصیل سے غافل نہ رہو، چاہے اس کے لئے چین ہی کا سفر کیوں نہ کرنا پڑے۔ چین کا لفظ اُس وقت کے عربی محاورہ کے مطابق انتہائی فاصلہ ظاہر کرنے کو ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ علم حاصل کرنے کی راہ میں کوئی بھی ملکی یا قومی تعصب حائل نہ ہونے پائے۔ یہ ہدایتیں آج بھی ایک دینی پیشوا کی زبان سے ایک حد تک نئی معلوم ہوتی ہیں اور پھر چھٹی صدی عیسوی میں جبکہ دنیا مختلف چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں اور ٹولیوں میں بٹی ہوئی تھی، اور ایک دوسرے کے خلاف نسلی اور وطنی تعصبات کی سنگین دیواریں اُٹھی ہوئی تھیں۔ اس وقت عام رواداری اور عالمگیر انسانیت کی تعلیم عرب کے ایک اُمّی کی زبان سے بجائے خود ایک معجزہ تھی۔

آج اُس نبیؐ رحمت کی یاد منانے کا دن ہے، جس کا فرمان ہے مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا، وہ خود رحم سے محروم رہے گا۔ شفقت و مہربانی کا یہ حکم کسی قبیلہ یا قوم کے ساتھ محدود نہیں، بلکہ نوع انسان کے لئے ہے اور نوع انسان بھی کیوں کہیے، یوں کہئے کہ ساری مخلوق خدا کے لئے ہے، جس میں چرندے اور پرندے، گھوڑے اور گدھے کتے اور بلی، کبوتر اور مرغی سبھی شامل ہیں۔ اور بعض حدیثوں میں تو نام لے لے کر بعض بے زبان جانوروں کے ساتھ

حسنِ سلوک پر بشارتیں آئی ہیں۔ عمل اس تعلیم پر ہو جائے تو آج ضرورت نہ کسی "انجمن برائے انسداد بیرحمی برحیوانات" کی رہ جائے اور نہ کسی گھوڑے کی چابکوں سے چھلی ہوئی پیٹھ دیکھنے ہی کو مل پائے۔

آج اُس رحمتِ عالم کا یوم میلاد ہے، جس کی لائی ہوئی آسمانی کتاب کا پہلا سبق یہ کہ خدا کا تعلق ربوبیت سارے ہی عالم وما فی العالم سے ہے۔ وہ خدا پروردگار قریشی کا نہیں، قوم عرب کا نہیں، گوروں کا نہیں، کالوں کا نہیں، مشرقیوں مغربیوں کا نہیں، بلکہ نیکوں اور بدوں، بڑوں اور چھوٹوں، سرداروں اور زیردستوں، شہزوروں اور کمزوروں، انسانوں اور جانوروں، سب ہی کا پروردگار ہے۔ ننھی سے ننھی بے حقیقت مخلوق، پتھر کے کیڑے تک کی پرورش کرنے والا، اس کو اس کے کمالات کی طرف چلانے والا، وہی ایک ہے —— اُخوتِ انسانی بلکہ ساری نظامِ کائناتی کی وحدت کی تعلیم اس سے زیادہ مؤثر و دل نشین انداز میں اور کیا ہو گی؟

اس نورِ نبوت نے جب اُجالا شروع کیا ہے تو دنیا طرح طرح کی تاریکیوں اور گھرے گھرے اندھیروں میں لپٹی ہوئی تھی۔ جہالت نے ایک خدا کی خدائی میں ساجھے دار خدا معلوم کتنوں کو بنا دیا تھا۔ اور مصلحِ برحق نے اپنی عظیم الشان اصلاحوں کا سنگِ بنیاد اسی عقیدۂ توحید کو رکھا۔ اس نے بندہ اور اُس کے خالق کے درمیان ربط براہ راست قائم کر دیا، درمیانی واسطوں کو مٹایا، اور دلوں اور دماغوں کا سہارا ماسوا کی طرف سے چھڑا دیا۔ اور عقیدہ کی ان بنیادی اصلاحوں کے معاً بعد وہ عملی زندگی کے سنوارنے اور سدھارنے میں لگ گیا۔ اور وہ

قانون اور ضابطے اس نے اپنے اللہ کے حکم سے پیش کیے جو ایک طرف فرد کو سدھارتے گئے، تو دوسری طرف سوسائٹی یا معاشرہ یا سماج کا اخلاق بھی نکھارتے گئے۔

شراب عرب سوسائٹی کا جزو اعظم تھی۔ ان کے اونچے طبقہ کے خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ دوستوں کی مجلس میں، برادری کی کسی دعوت میں، خاندان کی کسی تقریب میں پیمانہ کی گردش اور جام کے دور کے بغیر بھی زندہ دلی باقی رہ سکتی ہے۔ اسی مصلحِ اعظم نے آکر یہ عادت چھڑائی اور جو ابھی کل تک شرابی اور بلانوش تھے، انھیں دم کے دم میں پاکباز، محتاط، تہجد گزار بنا دیا۔ جنگ جوئی، خونریزی، نبرد آزمائی گویا عرب کے خمیر میں داخل تھی۔ برسوں سے نہیں، صدیوں سے قبائلی اور خاندانی رقابتیں چلی آتی تھیں اور عداوتیں گویا وراثت میں ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ رحمتِ عالم نے آتے ہی اس کینہ کو ہر سینہ سے دھو دیا۔ اور جہاں بغض و نفرت کی بھٹیاں دہک رہی تھیں۔ وہاں میل اور محبت کے پھول کھلا دئے۔ یہ معجزہ تنہا عرب ہی کے لئے نہیں ہوا۔ عدل، خدا ترسی اور ادائے حقوق کے قانون ایسے تعلیم کر دئے کہ ان پر عمل ہو تو آج بھی سارا عالم آتش کدہ سے گلزار میں تبدیل ہو جائے۔

سود در سود کے چکر سے دنیا جن مصیبتوں میں گرفتار چلی آرہی ہے، وہ سب پر روشن ہیں۔ غریبوں کا خون چوسنا اور اپنے اندر بجائے ہمدردی و شفقت کے سنگدلی اور بے دردی کے جذبات کو پرورش کرتے رہنا سود خوار غریب کی قسمت کا نوشتہ ہے۔ اور پھر دنیا میں جو بڑی بڑی خونریز لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، سوچ کر دیکھئے کہ اگر بڑے بڑے سودی قرضے نہ ملتے رہتے تو یہ ہولناک اور انسانیت سوز جنگیں کبھی واقع بھی ہو سکتی تھیں؟ دنیا

کے اس سچے رہبر اور دینِ حق کے پیمبر نے انسانیت کی اس دکھتی ہوئی رگ کو پکڑا، اور اپنی شریعت کے ذریعہ اس کا پورا قلع قمع ہی کر کے چھوڑا۔ یہ شرح سود ہلکی ہو یا بھاری، سودی معاملت کی ہر شکل اور ہر درجہ کو اُس نے حرام ہی قرار دے دیا کہ بغیر اس حرمتِ کلّی کے اس عذاب سے نجات پانا ممکن ہی نہ تھا۔

فحش وبدکاری کی وبا بھی دنیا پر ہمیشہ مسلّط رہی ہے۔ مصر، یونان، روما کے بڑے بڑے حکیم اور فلسفی اس سے بیش نہ پا سکے، بلکہ بہت سے تو خود ہی اس کے شکار ہو گئے۔ گندی شاعری، گندہ مصوّری، گندہ نقاشی، گندے ناچ رنگ، یہ سب اس کے لوازم طرح طرح کی دلکشی اور رغبت افزا ناموں کے ساتھ رہے ہیں۔ محمد ابن عبد اللہ کی لائی ہوئی شریعت نے ان ساری سڑی ہوئی لاشوں کے چہروں سے رنگین وخوشنما نقاب نوچ نوچ کر الگ کر دیئے، اور ہر گندگی کی بیخکنی بقدر اس کے مفسدہ کے کر دی۔

ان پیمبر میں اور وصف جو تھے وہ تو تھے ہی، ہزاروں کمالوں کا کمال یہ تھا کہ آپ حقیقت پسند (REALIST) اعلیٰ درجہ کے بلکہ بے نظیر تھے۔ آپ کی نظر عرفان ہمیشہ حقائق ہی پر رہتی تھی۔ اور آپ کی شریعت نے احکام جتنے بھی دئے ہیں وہ نہ شاعرانہ خیالی سبز باغ ہیں اور نہ فلسفیانہ وہمی نظریے ہیں بلکہ تمام تر انسان کے کام آنے والی حال ومستقبل دونوں میں عملی ہدایتیں ہیں۔

عورت کے حق میں دنیا عموماً افراط وتفریط ہی سے کام لیتی آئی ہے کبھی وہ گھٹائی گئی تو اتنی کہ جیسے اس کا شمار ہی دائرۂ انسانیت میں نہیں۔ اور کبھی بڑھائی گئی تو ایسی کہ جیسے مرد اس کے محکوم اور تابع ہیں۔ اس رسول کریم نے آکر اس کا صحیح مرتبہ قائم کیا اور بتایا کہ عورت کسی

حال میں مرد کی باندی نہیں بلکہ اس کی ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے بیوی ہے اور ہر رشتہ میں اپنے خاص خاص حقوق رکھتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے ذمہ خاص خاص فرائض بھی باپ کے، بھائی کے، بیٹے کے، شوہر کے لئے ہیں۔

غلاموں کو ایک دنیا ذلیل سمجھتی آرہی تھی۔ لفظ غلامی، ذلت و پستی کا مرادف بن گیا تھا۔ اس نبی نے آکر اس لعنت کو بھی دور کیا اور غلاموں کو انسانی حقوق ہی میں شریک نہیں کرایا بلکہ عملاً غلاموں اور آقاؤں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ چنانچہ ان نام کے غلاموں کی اگر فہرست تیار کی جائے تو ان میں نہ صرف امیر و وزیر، سپہ سالار اور بہادر شاہ تک نظر آئیں گے، بلکہ بہت سے نامور دینی پیشواؤں، فقہ و حدیث اور تفسیر کے عالموں کے بھی مل جائیں گے۔

ضعیفوں، مسکینوں، اپاہجوں، یتیموں، بیماروں کے ساتھ حُسنِ سلوک اور مدارات کی جو ہدایتیں اس ہادی کی لائی ہوئی کتاب اور خود اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں ملتی ہیں وہ اس کثرت سے ہیں کہ جمع کی جائیں تو خود ایک دفتر تیار ہو جائے۔ نمونہ کے طور پر اس وقت ایک حدیث مبارک کا خلاصہ سُن لیجئے۔ قیامت کے دن خدا اپنے بندے سے ارشاد کرے گا کہ میں بیمار ہوا تم نے میری خبر نہ لی۔ میں بھوکا رہا تم نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔ بندہ حیرت سے عرض کرے گا کہ الٰہ العالمین یہ کیونکر؟ تیری ذاتِ پاک تو ہر بیماری اور بھوک سے بالاتر ہے۔ ارشاد ہوگا کہ فلاں بیمار کو تو دیکھتا ہوا چلا گیا تھا۔ وہ ہم ہی تھے۔ فلاں بھوکا تیرے علم میں آیا تھا وہ ہم ہی تھے ——— حق یہ ہے کہ آپ کی نبوت پر

اور جتنے دلائل ہیں بالفرض وہ سب معدوم ہو جائیں اور آپ کی شریعت کے صرف وہی حصے باقی رہ جائیں جو عام خلائق اور اُس کے مختلف طبقوں کے ساتھ ہمدردی، محبت اور سلوک پر مشتمل ہیں تو تنہا یہی چیز آپ کی نبوّت کے اعجاز کے لئے کافی دلیل بن سکتی ہے۔

اس رسول نے جنگ کو سرے سے حرام نہیں قرار دیا، بلکہ اسے بعض حالات میں جائز اور بعض حالات میں واجب بھی بنا دیا۔ البتہ اس پر قیدیں بڑی بڑی سخت لگا دی ہیں۔ اور جہاد کو بجائے نفس پرستی یا ستم رانی کے ایک اعلیٰ درجہ کا مجاہدۂ نفس اور بہترین آلہ دفع ظلم کا بنا دیا۔ اسی طرح اس نے دنیا جہان کے مجرموں، چوروں، ڈاکوؤں، خونیوں، شرابیوں، جواریوں کے ہاتھ میں عفوِ عام کا پروانہ نہیں تھما دیا بلکہ اس نے اپنے وہی REALIST یا مصلح اکبر ہونے کی رعایت سے ہر پھوڑے پھنسی کے لئے الگ الگ نشتر، الگ الگ آپریشن بھی تجویز کر دئے۔ البتہ ثبوتِ جرم کا معیار بہت اونچا کر دیا۔ یہ نہیں کہ ادھر شبہ پیدا ہوا اور سزا ٹھونک دی گئی ـــــ فطرتِ بشری جب تک اپنی موجودہ کمزوریوں کیساتھ قائم ہے اور انسان کے خون فاسد میں گردش کر رہی ہے، مہر کیساتھ قہر کی اور شاباش کی تسلیوں کے ساتھ تادیب کی گوشمالیوں کی حکیمانہ آمیزش لازمی ہی نہیں عین رحمت و شفقت ہی کے مطالبہ کا پورا کرنا ہے۔ جس پاک ذات اور پاک صفات ہستی نے نہ صرف اپنی ان تعلیمات کے ذریعہ سے دنیا کو نمونۂ جنت بنا دینا چاہا، بلکہ ۲۲، ۲۳ سال کے حیرت انگیز حد تک قلیل وقفہ میں ان کی عملی جھلک بھی اپنے وطن میں دکھا دی تھی اور کئی لاکھ مربع میل پر عدل و فضل، مہر و شفقت کی عملداری، ..ت دشمن سب کی آنکھوں کے سامنے قائم کرا دی تھی، آج تاریخ

روایتِ مشہور کے مطابق اسی کی پیدائش کی ہے۔ لیکن اگر قرآن نے نہ بھی کہا ہوتا، جب بھی ان کارناموں سے واقف ہوجانے کے بعد عقلِ سلیم خود ہی سوال کرتی ہے کہ اگر اسے رحمۃ للعالمین نہ کہئے تو آخر کیا کہہ کر پکارئے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

---

(۲۲) کلیاتِ اکبر الہ آبادیؒ [1]

گردوں کے ستم دیکھے اُجڑا ہوا گھر دیکھا — دیکھا تو نہ جاتا تھا ناچار مگر دیکھا

ترنم کی توقع نہ رکھیے حضرت اکبر خود بھی اپنے کلام کو تحت اللفظ سادہ لہجہ میں پڑھتے تھے۔ اکبر الہ آبادی جیسے کہ وہ ۱۹۲۰ء سے قبل تھے ان سے تو یقیناً آپ خوب واقف ہوں گے۔ پڑھے لکھوں میں کون ان سے ناواقف ہے؟ اِس وقت ذرا اُن اکبر سے بھی ملاقات کر لیجیے جو نوجوان، جوان، ادھیڑ اور بوڑھے ہونے کے بعد اب ۱۹۲۰ء میں ۷۵ سال کے ہو چکے ہیں اور دنیا سے رحلت فرمانے کا زمانہ ڈیڑھ ہی دو سال باقی رہ گیا ہے۔ کلام میں جتنی پختگی آنا ممکن تھی سب آچکی ہے۔ جس غزل کا مطلع ابھی عرض ہوا ہے یہ اسی زمانہ کی ہے۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

اب آنکھ اُٹھانا ہے ایمان کی بربادی — اس بت کی نظر دیکھی اور اس کا اثر دیکھا

دوسرے کے بعد تیسرا اور چوتھا شعر ؎

تکبیر ہی اچھی تھی تقریر میں تھے جھگڑے — ترک ہم نے کیا اس کو جس شور میں شر دیکھا

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ ۲۷ جنوری ۱۹۴۹ء کی شام کو۔ وقت: ۱۵ منٹ۔

دنیا کی یہ زینت ہے عقبیٰ کے وہ ہیں علمے　　غافل نے اِدھر دیکھا، عاقل نے اُدھر دیکھا

پوری غزل میں بارہ شعر ہیں۔ مقطع دو ہیں دونوں سُننے کے قابل ہے

اس عہد میں اے اکبرؔ ہم اُسکو ولی سمجھے　　تھوڑا سا بھی جس دل میں اللہ کا ڈر دیکھا

صد شکر تری نظریں جھپکی نہیں اے اکبرؔ　　دنیا بھی بہت چمکی بت نے بھی سنور دیکھا

آخر عمر تک پہنچتے پہنچتے اور دنیا کے گرم و سرد کے تجربے ہوتے ہوتے مذہبیت کچھ یوں بھی آجاتی ہے اور پھر حضرت اکبرؔ تو ماشاء اللہ شروع ہی سے اپنی شوخی اور شوخ کلامی کے ساتھ ساتھ بڑا گہرا مذہبی رنگ اور بڑی گہری عرفانی نظر رکھتے تھے۔ منزلِ پیری پر پہونچے تو واقعی ایک شیخ وقت یا مرشد طریق بن چکے تھے۔ توحید، معرفت فنا و عبرت کا رنگ کلام میں جھلکتا ہوا ہمیشہ سے تھا اب غزل کے جام سے بھی یہی مضمون چھلکنے لگا اور قطعہ ہو یا رباعی، مثنوی ہو یا غزل ہر صنفِ کلام سے یہی چشمہ اُبلنے لگا۔

ردیف الف کی ایک غزل کا نمونہ آپ ابھی سُن چکے، اسی ردیف کی ایک دوسری مختصر سی غزل کے بھی دو ایک شعر ملاحظہ ہوں

ہے فضول نمائشِ جاہ و حشم ہے عبث یہ ذخیرۂ سیم و طلا
جو ترے نہ ہوئے تو وہ کچھ نہ ہوئے جنھیں تو نہ ملا انھیں کچھ نہ ملا

ترے ذکر کا ملتا رہے جو صلہ نہیں عمر کے ضعف کا مجھکو گلہ
مجھے عذر نہیں مجھے جب بھی پلا مگر اپنا ہی ساغرِ شوق پلا

اور ایک اور شعر حقّۂ غزلیات ہی کا ہے

واعظ بنا وہ اِس کا، پیرو ہوا یہ اُس کا
اُس نے خدا کو جانا اِس نے خدا کو مانا

مفہوم بالکل ظاہر ہے احکام الٰہی کا جو محض زبانی وعظ کہتا رہتا ہے اسے

خدا کا جاننے والا تو بے شک کہہ سکتے ہیں لیکن خدا کا ماننے والا تو وہی کہلائیگا جو ان احکام پر عمل بھی کرتا ہے۔

کلام کے ان نمونوں سے بدگمانی نہ گزرے کہ آخر عمر میں حضرت اکبر صرف اخلاقی یا واعظانہ رنگ کے شاعر رہ گئے تھے۔ اور ظرافت کا سرچشمہ خشک ہو چلا تھا۔ تردید کے لئے کلیات چہارم کا مفصل مطالعہ کافی ہوگا۔

سنہ۲۰ء میں برسات رُکی ہوئی تھی، اساڑھ جیٹھ کی طرح تپتا رہا اور ساون کورا نکل گیا۔ اسی پس منظر کو پیش نظر رکھ کر ظرافت کے چھینٹوں اور شوخی کی پھواروں کا ذرا لطف اُٹھائیے ؎

گرمی نہیں کھسکتی پانی نہیں برستا	ساون بھی بادلوں کو اس سال ہی ترستا
پوری سزا ملی ہے خود ہو رہے ہیں خستا	حلوائیوں کو بھی ہے گرمی سے تلخ کامی
بازار میں جوان کو کپڑا ملا نہ سستا	کرنا پڑیگی باہم یاروں کو چشم پوشی

یہ حلوائیوں کی میٹھی میٹھی باتوں کے مقابلہ میں "تلخ کامی" کیا خوب اور "پوری" اور "خستہ" کی خوشبوئیں تو یقین ہے کہ ایتھر کی لہریں طے کرتی ہوئی آپ سب تک پہنچ رہی ہوں گی۔ پھر بھی تیسرے شعر کا بلیغ مضمون یہ سمان پیش کر رہا ہے کہ خشک سالی کے باعث گرانی ہوگی جس کا اثر کپڑے پر بھی پڑا غریب کو تن پوشی بھی پوری طرح میسر نہیں رہی نتیجہ یہ ہوا کہ حیاداروں کو خود ہی نظریں نیچی کر لینی پڑیں۔

حضرت اکبر کا زمانۂ وفات ستمبر سنہ۱۹۲۱ء کا ہے۔ سنہ۱۹ء کے وسط تک ان کے کلام کا جو مجموعہ تھا اور اس میں جتنے حصے کو وہ قابل اشاعت سمجھتے تھے وہ ان کی زندگی میں ان کے کلیات کے تین حصوں میں شائع ہو چکا تھا۔ کچھ حصہ چھپنے سے انھوں نے اس وقت بھی چھوڑ دیا تھا۔ بے حد ذہین اور

نہایت پرگو تھے۔ چھوٹی بڑی ہر چیز پر کچھ نہ کچھ فرماتے ضرور۔ کبھی کسی شعر کو تو وقت کی سیاسی مصلحتوں سے چھپا ڈالتے اور کبھی کسی شعر کی اشاعت سے دوسروں کی ناگواری یا دل آزاری کا ان کو گمان گزرتا اسے بھی دبا دیتے اور پھر جس شعر سے ان کی خودداری پسند طبیعت یعنی شوخی نیم عریانی کی حد تک پہنچ جاتی اس کی اشاعت بھی گوارا نہ رکھتے۔ وسط ۱۹ء سے لیکر ستمبر ۲۱ء تک جو کچھ فرمایا وہ سارا مسودہ بے ترتیب اور منتشر کاپیوں پر ان کے ہاتھ سے لکھا ہوا اب تک پڑا رہا۔ اور ۴۷ء میں جب ان کے صاحبزادہ کا بھی انتقال ہو لیا جب کہیں ان کے پوتوں نے اس کی اشاعت کی اجازت دی۔ کتابستان (الہ آباد و کراچی) نے اس مجموعہ کو کلیات اکبر حصہ چہارم کے نام سے حال میں شائع کیا ہے۔ اور افسوس ہے کہ نہ کتاب کی ترتیب و تہذیب میں اپنی کسی خاص خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے اور نہ صحت و کتابت و طباعت میں کسی معمولی سی توجہ و محنت کا۔ نتیجہ یہ ہے کہ غلطیاں بڑی کثرت سے رہ گئی ہیں یہاں تک کہ مصرعے کے مصرعے غیر موزوں ہو گئے ہیں۔ پھر اکبر کی شاعری تو بڑی حد تک واقعاتی شاعری تھی۔ اپنے دور کے بکثرت واقعات کی طرف وہ اشارہ کرتے جاتے تھے۔ ان تلمیحات سے لطف اٹھانے بلکہ محض سمجھنے کے لئے کثرت سے نوٹ اور حاشیے لازمی تھے۔ اس کا خیال بجز آخر کے چند صفحوں کے اور کہیں بھی نہیں رکھا گیا ہے۔ ان بڑی اور اہم فروگذاشتوں نے افسوس اور سخت افسوس ہے کہ کتاب کا لطف بہت کچھ کھو دیا ہے۔ اور اندیشہ قوی ہے کہ کہیں اس کا اثر خود شاعر کی شہرت و عظمت پر نہ پڑ جائے۔ لیکن جو صاحب فہم و ادراک ہیں خود ہی سمجھ لیں گے کہ لذیذ سا لذیذ کھانا بھی اگر بدسلیقگی کے ساتھ کثیف

اور گندی پلیٹوں میں نکال کر میلے کچیلے دسترخوان پر چن دیا گیا ہے تو اس میں پکانے والے غریب کا کیا قصور؟ ۔ بہرحال جو کلام آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے وہ اسی کلیات سے ہے ۔ ضخامت کچھ زیادہ نہیں ۲۲×۲۶ کی تقطیع پر ۸۰۰ اصفحہ کی ہے ۔ آپ نے اب تک ردیف الف کی سیر کی۔ اجازت دیجیے کہ ورق اُلٹنے سے قبل دو تین شعر اور اسی ردیف کے عرض کر دیئے جائیں ۔ ایک غزل ہے "سامان نہیں دیکھا" کی زمین میں ۔ اس میں دو شعر جو اکبر حکیم و عارف نے نکالے ہیں یہ انھیں کا حصہ تھا ؂

غفلت میں تو پیری بھی نظر آتی ہے خود بیں
عبرت میں جوانی کو بھی نازاں نہیں دیکھا

جب مادہ غائب ہو گدازآئے کہاں سے
شمعوں کی طرح لمپ کو گریاں نہیں دیکھا

موم بتی اور لیمپ کے فرق سے یہ ندرت مضمون کیا خوب پیدا کی ہے! ـــــ اسی کے متصل ایک سیاسی رنگ کی غزل میں "اقبال ان کا" "چنگال ان کا" میں فرماتے ہیں اور خوب خیال کر لیجیے کہ ۱۹۴۶ء و ۱۹۴۷ء میں نہیں بلکہ لارڈ ریڈنگ کے گورا شاہی دبدبہ اور جبروت کے عین شباب ۱۹۲۱ء میں اکبر کی نگاہ کشفی نے اُن کی زبان سے کہلا دیا تھا ؂

اس تمنا کے بر آنے میں بہت دیر نہیں
یعنی ہم صیغۂ ماضی میں سُنیں حال ان کا

حال کی معنی بیان قصہ و سرگذشت کے ہیں لیکن ماضی کے تلازمہ نے اس میں جان بھی کیسی ڈال دی ہے!

ردیف الف ختم ہوئی ۔ ایک سرسری اُچٹتی سی ورق گردانی آگے بھی سہی۔ لیکن کہیں کہیں تو کوئی شعر بہرحال حلقۂ زنجیر بن کر رہے گا ۔ ردیف "ر"

کے ان دونوں شعروں نے ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء دور تحریک خلافت و ترک موالات (نان کو آپریشن) کی یادیں تازہ کر دیں۔ الہ آباد کے شاہ مولانا محمد فاخرؒ اور فرنگی محل لکھنؤ کے مشہور عالم و پیشوا مولانا عبدالباریؒ کی صورتیں نظر کے سامنے کر دیں۔ پہلا شعر ہے ؎

سرکار تو ہے شاد کہ گاندھی ہوئے حاضر اور قوم ہے مغموم کہ بگڑے گئے فاخرؒ

گاندھی جی لارڈ ریڈنگ سے ملنے ان کی طلبی پر گئے۔ اور دوسرا شعر ؎

اے چرخ ہوائے شوق چلے اے شاخ عمل گلباری کر
کچھ سعی کریں کچھ کام کریں ہر شیخ کو عبدالباری کر

حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام، پنڈت مدن موہن مالوی ان سب کا ذکر کہیں نام کی صراحت کے ساتھ اور کہیں اشارے کنائے میں اس مجموعہ کے اندر موجود ہیں اور گاندھی جی اور علی برادران کا تذکرہ تو قدرۃً بہت زائد ہے۔ کہیں مدح و توصیف کے ساتھ اور کہیں ہجو و تعریض کے لہجہ میں۔ سیاسیات پر انھیں جو کچھ کہنا تھا اسے اکثر تو اپنے حسب عادت وہ دل لگی کی لپیٹ میں کہہ گئے ہیں مثلاً ؎

غرض اس سے نہیں مجھ کو بنی ہے یہ زمیں کیونکر
یہ فرمائیں میسر آئے گی نان جویں کیونکر

کہیں کہیں ان کی ظریفانہ شاعری کی جان صرف ان کا لفظی داخل خارج ہوتا ہے اور اگر سننے والے کی نظر اس طرف نہیں گئی تو شعر بے معنی معلوم ہوگا چنانچہ اس رنگ کا شعر ہے ؎

داد کیسی روٹی کی لالچ سے ہے یہ واہ واہ
شعر تو "دادی" ہے لیکن واہ وا "نانی" ہے صرف

اس کے دوسرے مصرعہ سے لطف اُٹھانے کے لئے لازمی ہے کہ یہ ذہن نشین رہے کہ "دادی" یہاں صفت ہے "داد" کی اور "نانی" صفت ہے نان کی، اور ان دونوں کا ذکر پہلے مصرعہ میں آچکا ہے۔ بعض غزلیں صرف دو دو شعروں کی ہیں۔ لیکن ان دو میں بھی ایک ایک شعر کہنا چاہیے کہ پورے دیوان کی معنویت رکھتا ہے۔ یہ مبالغہ نہیں۔ آپ بھی سُن کر تائید ہی کریں گے شعر ملاحظہ ہوں ؂

ملی ہیں دل سے جو مجھکو وہ نازک اطلاعیں ہیں
خدا ہے اور فطرت صرف اس "ہے" کی شعاعیں ہیں

جوانی کی بہارِ باغ کی عمر دو روزہ کی
مرے دیوان کی نظموں میں کیا کیا الوداعیں ہیں

عارفانہ رنگ میں پہلا شعر اور عاشقانہ رنگ میں دوسرا شعر تو دامن نظر کو کھینچے بغیر کسی طرح نہیں رہے گا ؂

اخبار میں میرا حال شائع نہ کرو مصروف دعا ہو وقت ضائع نہ کرو

سیاسیات وقت سے اکبر کی دلی بیزاری تو اس شعر میں آگئی اور دوسرے میں ان کے سارے فلسفہ الٰہیات کا نچوڑ آگیا ہے ؂

جتنا زمانہ حشر کے پہلے ہے سب ہے آج کہتا ہوں کل میں صرف قیامت کے روز کو

ردیف "ی" قدرتاً ذرا لمبی ہے۔ دو چار منٹ اس کی سیر میں بہر حال لگ جائیں گے۔ وحدت الوجود کے مضمون کو فارسی اور اردو کے بہت سے صوفی شاعروں نے اپنے اپنے رنگ میں ادا کیا ہے۔ اب ذرا اکبر کا کمال دیکھیے کہ کس لطافت اور جامعیت کے ساتھ اس سارے دریا کو دو ایک لفظوں کے کوزہ میں بند کر دیا ہے ملاحظہ ہو ؂

خرد پوچھتی ہے یہ کیا ہو رہا ہے صدائے دلی ہے خدا ہو رہا ہے

"خدا ہو رہا ہے"۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے یہ سب خدا ہی کے ظہور کی شانیں ہیں۔ اس کو اس نادر اسلوب سے ادا کرنا حصہ ہے اکبر کا۔ اسی لے میں ایک اور گیت ؎

کیا بتاؤں سخن ہوش ربا کے معنی خود بخود کے وہی معنی جو خدا کے معنی

اور اس سے بھی بڑھ کر ؎

یہ مصرعہ مرے ہوش کو کھو رہا ہے وہی تھا، وہی ہے، وہی ہو رہا ہے

"صاحب" پر چوٹیں ہلکی اور لطیف چوٹیں تو اکبر کی شاعری کی جان تھیں۔ سیاسی گفتگوئیں آج کی صحبت میں مناسب نہیں لیکن اتنا سُن لینے میں تو کوئی مضائقہ بھی نہیں ؎

شکر اس کا بھی ہے واجب، انکی خدمت بھی ضرور

جان دی اللہ نے اور نوکری صاحب نے دی

طریقت اور شریعت کا جھگڑا صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اکبر صاحب ایک اشارہ کر دیتے ہیں اور دونوں کے گلے خود بخود مل جاتے ہیں ؎

یہی الفاظ کہہ کر ذہن خفتہ کو جگاتا ہے

شریعت سر جھکاتا ہے طریقت دل لگاتا ہے

یہی مضمون بدلے ہوئے لفظوں میں ؎

نہ صورت کا تصنع ہے نہ رسموں کا تکلف ہے

شریعت کی بہ دل تعمیل ہو بس یہ تصوف ہے

اور اس سے بھی زیادہ ہلکے پھلکے لطیف و نرم انداز میں ؎

شریعت طریقت کو کیا پوچھتے ہو شریعت ہے تم پر طریقت ہے تم میں

اس بحث میں بالکل حرف آخر یہ قطعہ ہے

شریعت میں ہے صورت فتح بدر
طریقت میں ہے معنی شق صدر
نبوت کے اندر رہی ہیں دو نور نگ
عبث ہے یہ ملا و صوفی کی جنگ

قطعات اور رباعیات کے حصہ میں خوب خوب گل کھلائے ہیں۔ وقت یہ ہے کہ تحریک خلافت و تحریک ترک موالات زوروں پر ہے مگر وہی جیسے کوئی صوفی گوشہ نشین اپنی خانقاہ میں بیٹھا ہوا دنیا کے اُتار چڑھاؤ اور سلطنتوں کے انقلاب کو دیکھا کرتا ہے اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے کوئی نعرہ مستانہ و رندانہ لگا دیتا ہے۔ کبھی تو چہرہ پر ظرافت کا نقاب ڈالے ہوئے۔ مثلاً ہے

نئی روشنی کا ہوا تیل کم
حکومت نے اس سے کیا میل کم
ادھر مولوی کس میرسی میں تھے
نہ آفس میں تھے وہ نہ کرسی میں تھے
یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جایئے
سیاسی کمیٹی میں پل جایئے
اسی میل کا آج کل ہے ظہور
خدا جانے ظلمت ہے اس میں کہ نور

اور کہیں سیدھے سادے بول میں ہے

چکر میں ہے آج ہسٹری بھی
چرخہ بھی ہے اور منسٹری بھی
مرکز سے بہت ہٹے ہوئے ہیں
میدان میں مگر ڈٹے ہوئے ہیں
جن پر ہے خدا کی مہربانی
دونوں کو سمجھتے ہیں وہ فانی

اور کہیں خوان ظرافت کا ہے لیکن اس کے اندر لگی ہوئی نعمتیں معرفت و ذکر آخرت کی ہیں ہے

ہے چھتری بھی چپ بیٹھا ہے نہ بانگ ہے
پوری بھی خشک اب ہے کہ گھی جھ چھٹانک ہے
کپڑا گراں ہے ستر ہے عورت کا آشکار
کچھ بس نہیں زباں پہ فقط ڈھانگ ٹھانک ہے

بھگوان کا کرم ہے سدیشی کے بیل پر لیڈر کی کھینچ کھانچ ہے گاندھی کی ہانک ہے
اکبر پہ بار ہے یہ تماشائے دل شکن اسکی تو آخرت کی طرف تاک جھانک ہے

ان کا اصلی مذاق طبیعت تو یہ ہے کہ ؎

پتلون کے بٹن سے دھوتی کا پیچ اچھا دونوں سے وہ جو سمجھے دنیا کو ہیچ اچھا

اور اس بنا پر اپنے وقت کی تحریکات اور جوش وخروش کو رشک وحسرت کی نظر سے نہیں صرف عبرت کی نظر سے دیکھ کر رہ جاتے ہیں ؎

نہ دلوں میں اب ہے وہ ذوق حق نہ دعا کا یاد ہے وہ سبق
نہ وہ آہ ہے نہ وہ شوق ہے نہ وہ تیر ہے نہ کمان ہے
نہ کمیٹیوں کی ترنگ اسے نہ ہوائے حملہ و جنگ اُسے
کرے کیا اب اکبر مضمحل نہ وہ طفل ہے نہ جوان ہے

اب ان کی آخری گذارش انھیں کے لفظوں میں سن کر بہتر ہوگا کہ حکمت و دانش کی اس محفل کو اسی نقطہ پر برخاست ہو جانے دیجئے ؎

اتنا ہی گزارش کرنا ہے ہر ایک کو ایک دن مرنا ہے
ایشور کی خوشی تو پُن میں ہے شیطان ہی ہوگا پاپ سے خوش
بابو تو پریس کے اندر ہیں اور پنڈت محو مندر ہیں
بھگوان نے جس کو جیسا کیا وہ چھاپ سے خوش یہ جاپ سے خوش
عیسیٰ نے دل روشن کو لیا اور تم نے فقط انجن کو لیا
کہتے ہیں کہ وہ تھے باپ سے خوش اور تم ہو خالی بھاپ سے خوش
ہیں خلق کی حالت جانچوں گا تو قد کی بلندی دیکھا کر
ہے یہ تو نگاہ اپنی اپنی ہیں وزن سے خوش تو ناپ سے خوش

(۲۳) مولانا عبدالباری فرنگی محلی[۱]

بات سنہ ۱۹۲۰ء کے آخر کی ہے یا شاید شروع سنہ ۱۹۲۱ء کی۔ ایک روز سہ پہر کو دیکھتے کیا ہیں کہ موٹروں پر موٹریں آ کر فرنگی محل کے پل پر رک رہی ہیں اور ملک کے مشہور لیڈر ایک سے ایک اونچے اتر رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج شہر میں خلافت اور کانگریس کمیٹیوں کے اجلاس ہیں اور ملک بھر کا لیڈر ان میں اُمنڈ آیا ہے لیکن شہر کے اس محلہ سے ان حضرات کو واسطہ کیا؟ یہ لیجئے اب تو سواریاں پُل کے ڈھال سے اُتر پارچہ والی گلی میں چلنے بھی لگیں۔ اور پہچانئے یہ تو پنڈت موتی لال نہرو اُترے۔ یہ ان کا سا نفاست پسند اور شاہانہ مزاج کا لیڈر اس میلی کچیلی گلی میں کہاں۔ اور دیکھئے یہ مسز سروجنی نائیڈو کا جلوہ نظر پڑا۔ یہ قیصر باغ اور ڈالی باغ کے سبزہ زاروں کو چھوڑ چھاڑ اِدھر کیسے؟ وہ حکیم اجمل خاں نکلے۔ یہ ڈاکٹر انصاری نمودار ہوئے۔ وہ لالہ لاجپت رائے دکھائی دیئے۔ غرض

---

[۱] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ ۱۲ر جنوری سنہ ۱۹۵۰ء کی شام کو۔ وقت: ۱۵ منٹ۔ (بہ سلسلہ مشاہیر لکھنؤ)۔

کانگرس اور خلافت اور ترک موالات کے جتنے بھی لیڈر رہیں کیا بڑے اور کیا چھوٹے، کیا ہندو اور کیا مسلمان، کیا پنجابی اور کیا گجراتی، سب ہی تو نظر آرہے ہیں اور اب دیکھئے سب کا رخ فرنگی محل کے مشہور مکان محلسرا کی طرف پھر گیا۔ مشہور عالم وفاضل مولانا قیام الدین عبدالباری کی مشہور حویلی، وہیں دن کے کھانے کی دعوت ہے۔ عقدہ اب کھلا۔ اللہ اکبر! یہ لیڈر فرنگیوں سے اس قدر بیزار اور ایک فرنگی محلی کے یارِ غار! اور یہ دعوت کچھ آج پہلی یا آخری بار تھوڑے ہی ہے۔ محل سرا تو گویا اب مہمان سرا ہے۔ ہر روز دعوتیں، آئے دن مہمان داریاں، ہر دعوت مہمان اور میزبان دونوں کے شایان شان۔

مولانا کی شخصیت اپنے زمانہ میں (اور وہ زمانہ ابھی کل ہی کی بات تو معلوم ہو رہا ہے) ایک عجیب وغریب بابرکت و نفع رساں، صاحب علم و عمل اور جامع ذات گزری ہے۔ خاندان فرنگی محل پشتہا پشت سے نامور چلا آرہا تھا یہ بزم ہستی میں آخر میں آئے لیکن بساطِ عظمت پر جب بیٹھے تو کسی سے نہ ہیٹے رہے نہ پیچھے۔ سال پیدائش ۱۸۷۸ء ہے وہی سال جو چند مہینہ ہٹ کر مسلمانوں کے محبوب ومشہور لیڈر مولانا محمد علی کا سنہ ولادت ہے۔ وفات ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ گویا عمر کچھ بھی نہ پائی۔ ۴۸ سال کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔

دین کی خدمت، پڑھنے پڑھانے کا، لکھنے لکھانے کا ورثہ بزرگوں سے ساتھ لائے تھے، اپنی ذات سے یہ سارے جوہر چمکا دیئے۔ پڑھنے کے زمانہ میں علم کی بھوک اس بلا کی تھی کہ لکڑی کے کھرے پلنگ پر سرہانے چمڑہ کا کڑا تکیہ رکھ کر سوتے کہ زیادہ غفلت نہ ہونے پائے اور رد شنی

پاس رکھی ہوئی، اِدھر آنکھ کھلی اُدھر کتاب پر نظر جم گئی۔ بیوی کو دل و جان سے چاہتے تھے وہ بیچاری اپنی کمسنی میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ یہ ان محبوب کو آغوشِ لحد میں اُتار عین اس روز بھی استاد کے سبق میں موجود! پڑھانے کی حرص کا یہ عالم کہ ابھی تحصیلِ علم جاری ہی تھی کہ تدریس شروع کردی، پڑھ ہی رہے تھے کہ پڑھانے بھی لگے اور آخر میں تو یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ بعد فجر بھی سبق اور قبل دوپہر بھی سبق اور سہ پہر کو بھی سبق اور اکثر شب میں بھی سبق۔ شاگردوں کا شمار کون کرے۔ خدا جانے کتنے بے علموں کو پڑھا لکھا بنا دیا، حرف شناسوں کو فضیلت کی دستار بندھوا دی ـــــــ ایک چیز میں اپنے بزرگوں سے بھی آگے بڑھ گئے۔ ان کے ہاں معقول و منقول کے اور درس تو بہت سے ہوا کرتے تھے مستقل قرآن مجید کا کوئی درس نہ تھا۔ آپ نے انگریزی خوانوں کا ایک مختصر کلاس لے درس قرآن کی طرح ڈال دی۔ شاید پانچ پارے ہو پائے تھے کہ جنّت سے بُلاوا آگیا۔

ایک اور چیز میں بھی اپنے بڑوں سے بازی لے گئے تھے ان کے زمانہ تک پڑھانے کا وہی پرانا طریقہ نج کا جاری تھا یعنی ہر استاد کی ذات خود ایک مدرسہ بنی ہوئی، آپ نے پہلی بار یہ کیا کہ اس فیض جاری کو ایک نظام کے ماتحت اور ضابطوں کی قید میں لا کر ایک باقاعدہ درس گاہ کی شکل دے دی، نام اپنے مورث اعلیٰ اور بانی درس نظامیہ ملا نظام الدین کے نام پر مدرسہ نظامیہ رکھا۔ مولوی اور مولانا کے امتحانات اور سندیں جاری کیں اور اپنی ہمت عالی سے کام لے کر بڑے بڑے عطیے اور درماہے اس کے لئے رئیسوں سے حاصل کر لئے۔

قلم اُٹھایا، تو تصنیف و تالیف کا ایک انبار لگا دیا۔ سیرت، سلوک، صرف، نحو، ادب، منطق، فقہ، اصول فقہ، کلام، مناظرہ، حدیث و تفسیر خدا جانے کتنے علوم و فنون پر چھوٹی بڑی سو سے اوپر کتابیں تیار کر دیں اردو کے علاوہ عربی میں بھی اور یہ گنتی تو مستقل کتابوں کی ہوئی، حاشئے جو بہت سے لکھ ڈالے ان کا شمار ہی نہیں ـــــــ مدت عمر پھر ایک بار یاد کر لیجئے کُل ۴۸ سال۔ بعض بعض کتابوں کے نقشے اور منصوبے تو ان کے سامنے عظیم الشان تھے مثلاً نئے علم کلام پر سائنس و کلام کے نام سے ۴۲ جلدیں پیش نظر تھیں ان میں صرف ایک لکھ پائے تھے اور وہ بھی پوری نہیں اس کا صرف حصہ اول اسی طرح مفصل تفسیر القرآن الطاف الرحمٰن کے کل دو پارے چھپ پائے۔

تصوف و سلوک کے کوچہ کو بھی خوب چھانے ہوئے تھے۔ محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم پر حاشئے لکھے۔ مثنوی مولانائے روم کا مدتوں درس دیتے رہے۔ مجاہدوں پر مجاہدے شرعی اور دینی رنگ کے عمر بھر کرتے رہے۔ ہر وقت باوضو رہتے۔ نماز فجر سے اشراق کے وقت تک اوراد و وظائف میں لگے رہتے۔ شعبان، ذالحجہ محرم کے مخصوص روزے کوئی خالی نہ جانے پاتے۔ نفلی نمازوں کا اہتمام رکھتے اور نماز باجماعت کا تو وہ التزام تھا کہ سفر تک میں چھوٹنے نہ پاتی۔ ساتھ رہنے والوں کی شہادت ہے کہ عمر بھر میں جماعت صرف ایک بار ناغہ ہوئی ہے، اور یہ فضیلت نہیں کرامت ہے۔ طریقہ قادریہ کے مشائخ میں ایک خاص امتیازی مقام رکھتے تھے۔ حلقہ بیعت و ارادت میں وقت کی اچھی اچھی معروف معروف ہستیاں تھیں، اور دو مرید تو ایسے ہاتھ آگئے تھے جن کا نام عجب

نہیں کہ رہتی دنیا تک رہ جائے یعنی محمد علی اور شوکت علی۔

"بزم صوفیہ" جب تک جیتی جاگتی رہی اس میں سب سے پیش پیش تھے۔ اور جمعیۃ العلماء جس کے نام کی گونج آج تک گھر گھر ہے وہ تو کہنا چاہئے کہ بڑی حد تک مولانا ہی وجود میں لائے تھے۔ امرتسر میں دسمبر ۱۹ء میں لیگ و کانگریس کا جو معرکہ کا جلسہ ہوا تھا وہیں جمعیۃ کی بھی بنیاد پڑی تھی ـــــ مولانا جمعیۃ سازی اور انجمن آفرینی کے کام میں کچھ اپنے یا نو آزمودہ نہ تھے مدتوں پیشتر جمعیۃ خدام کعبہ کے نام سے ایک بڑی پرزور اور پرشور انجمن قائم کر چکے تھے جس کی ممبری تک اس زمانہ میں خطرناک تھی۔ پھر ۱۹ء میں اور چند رفیقوں کو ساتھ لے آل انڈیا خلافت کمیٹی کے نام سے وہ عظیم الشان ادارہ بنا چکے تھے جس کی یاد اب بھی بہت سے دلوں میں تازہ ہوگی یہی وہ طوفانی ادارہ تھا جس نے ایک طرف برطانی حکومت کی بنیادیں ہلادیں اور دوسری طرف سارے عالمِ اسلامی کے جمود میں حرکت پیدا کردی۔

سیاست میں مولانا کا جو پایہ اور سیاسی دنیا میں ان کا جو اثر تھا اس کے لحاظ سے وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ ملک کے اندر چھوٹا بڑا جو بھی سیاسی مسئلہ چھڑتا، ممکن نہ تھا کہ اس میں ان کا حصہ اور نمایاں حصہ نہ ہو۔ ۱۱ء و ۱۲ء کی جنگ طرابلس اور پھر جنگ بلقان کے سلسلہ میں جو خدمتیں بھی ہندی مسلمانوں سے ترکوں اور طرابلسیوں کی بن پڑیں ان میں اولیت کا عَلَم مولانا ہی کے ہاتھ میں تھا۔ ۱۳ء میں جب صوبہ کے اندر مسجد کانپور کا ہنگامہ پیش آیا تو دیکھنے والوں نے پھر دیکھا کہ مولانا کا قدم کسی سے پیچھے نہیں آگے ہی ہے ـــــ یہ سب

مثالیں تو اسلامی سیاست کی تھیں۔ رہے ملک کے عام سیاسی مشترک مسئلے تو مولانا اس میدان کے مرد نہیں جوانمرد ثابت ہوئے۔ ان موقعوں پر نہ وہ گوشہ نشین مولوی نکلے اور نہ حجرہ گزیں عابد۔ بلکہ صف اول کے مجاہدوں میں شامل ہوتے۔ اور ہر جگہ علی برادران، اور ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کے دوش بدوش ہوتے، کانگریس کمیٹی ہو یا خلافت کمیٹی سب کو وہ اپنے ختورد سے مستفید کرتے اور سب کی جدوجہد میں عملی حصہ لیتے رہتے۔

علی برادران تو ان کے اپنے خاص الخاص تھے ہی، عزیزوں سے بڑھ کر عزیز اور مخلصوں سے بڑھ کر مخلص، فرنگی محل جیسے ان کا گھر ہی ہو گیا تھا۔ مرشد خود ان کی خدمت کے لئے بچھے جاتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہرؔ کی ایک غزل کے شعر میں اسی طرف اشارہ ہے۔

ان کا کرم ہی ان کی کرامت ہے ورنہ ہاں
کرتا ہے کوئی پیر بھی خدمت مرید کی

باقی جو ملک کے ہندو لیڈر تھے ان سے بھی مولانا کے تعلقات عام دوستی سے گزر کر یگانگت اور یارانے کے حد تک پہنچے ہوئے تھے اور خود گاندھی جی سے تو جیسی گاڑھی چھنا کی اس کی تو کچھ پوچھئے ہی نہیں۔ حد یہ ہے کہ گاندھی جی اس صورت میں دوبار لکھنؤ آئے اور یہ زمانہ وہ تھا جب گاندھی جی کو ہاتھوں ہاتھ لینے والوں اور ان کی مہمان داری کو اپنے لئے فخر و ناز کی چیز سمجھنے والوں کی کمی کیا تھی۔ ع

لاکھوں تھے دست شوق ہزاروں کنار شوق

لیکن وہ دونوں بار محلسرا ہی کے ایک ڈیرہ میں ٹھہرے ——— آخر کوئی بات تو تھی جو بڑے بڑے آرام دہ اور تفریح کے مقامات چھوڑ مہاتمانے

مولانا ہی کے کاشانہ کا انتخاب کیا۔

یہی وہ زمانہ ہے کہ مولانا کی بے پناہ عملی سرگرمیوں نے وقت کے نامور اور حساس شاعر لسان العصر حضرت اکبر کو متاثر کیا اور ان کی زبان حقیقت ترجمان سے یہ شعر کہلادیا تھا۔

اے چرخ ہوائے شوق چلے ہاں شاخ عمل گلباری کر
کچھ کام کریں کچھ سعی کریں ہر شیخ کو عبدالباری کر

فیاضی اور مہمان نوازی کے تو کہنا چاہیئے کہ بادشاہ تھے۔ اللہ نے صاحب مقدرت بنایا تھا لیکن حوصلہ حیثیت سے کہیں بڑھا ہوا تھا اور لوگوں کے کھلانے پلانے میں، نقد وجنس سے ان کی مدد کرنے میں علانیہ اور پوشیدہ ان کی جیبیں پر کرنے میں لحاظ اپنی حیثیت کا نہیں اپنے حوصلہ کا رکھتے تھے اور اس میں کوئی فرق اپنے پرائے، دوست اور دشمن کا روا نہ رکھتے پُرانے دسترخوانوں پر اکثر فارسی کا یہ مصرعہ چھپا ہوا دیکھنے میں آتا تھا کہ

برین خوان یغما چہ دشمن چہ دوست!

مصرعہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے ہاں ہر دسترخوان کے لئے فال نہیں حال تھا۔ نفیس اور لذیذ کھانوں سے شوق رکھتے تھے۔ کھانے سے زیادہ کھلانے کا۔ دوسرے کھاتے تھے اور یہ دیکھ کر خوش ہوتے جاتے تھے کشمیری چائے کا پینا پلانا تو ان کا حصہ تھا۔ صبح جب چاہیئے تو سماور پر سماور تیار، پیجیئے اور ہونٹ چاٹتے رہیئے۔ سنگین اتنی کہ آدھی پیالی میں پیٹ بھر جائے، لطیف اتنی کہ پیالیاں خالی ہو جائیں اور نیت نہ بھرے۔

مزاج میں حدت وحرارت تھی بات ناگوار جلد ہو جاتی لیکن گرانی جس تیزی سے آتی اسی تیزی سے دور بھی ہو جاتی اور پھر معذرت، صفائی،

دلجوئی کی وہ وہ تدبیریں کرتے اور راس اس طرح مناتے کہ جی یہ چاہنے لگتا کہ ایسے موقع ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیدا کئے جائیں۔ وقت عزیز مخلوق کی حاجت برآری کے لئے وقف رکھتے۔ ابھی کسی کی عیادت کو جا رہے ہیں ابھی کسی دکھیارے کو ڈھارس دیئے چلے آ رہے ہیں غرض یہ کہ مشغلے دو ہی تھے۔ خالق کی طاعت وعبادت اور مخلوق کی مخلصانہ خدمت۔

مولویانہ خشکی کہیں آس پاس نہ تھی۔ نورانی مسکراتا ہوا چہرہ دمکتا ہوا سرخ وسفید رنگ، خوش نما خوب سیاہ داڑھی، گٹھا ہوا ورزشی بدن۔ باغ وبہار بذلہ سنج طبیعت، لطیفوں سے لطف لیتے اور خود بھی کہنے سے نہ چوکتے۔ ذہانت وذکاوت کے پتلے تھے۔ ۲۲ء کا ذکر ہے سفر اجمیر میں لکھنؤ سے ساتھ ہوا۔ قافلہ میں رفیق سفر حضرت شیخ الطاف الرحمن بھی تھے۔ شیخ صاحب ہیں مہمان نوازنہ۔ اتفاق سے رات کے وقت ناشتہ سے تنہا شغل فرمانے لگے۔ اس خاکسار نے برجستہ عرض کیا۔

الطاف سے بعید تھا کھانا الگ الگ!

شیخ صاحب تو مسکراتے رہے۔ مولانا نے پے در پے مصرعہ لگانا شروع کر دیئے، ہوتے ہوتے پوری غزل تیار کر دی۔ غزل اور نظم سے یوں بھی کبھی کبھی شوق کر لیا کرتے۔ کلام میں شوخی اچھی خاصی ہوتی۔ کہہ کر اپنے ایک عزیز حضرت زخمی کو بخش دیتے اور کلام منسوب انھیں کے نام سے ہو جاتا۔

صحت بالعموم بہت اچھی رہتی تھی۔ جنوری ۲۷ء تک اچھے خاصے تندرست وتوانا عرس اجمیر کے سفر کے لئے روانہ ہو ہی رہے تھے کہ وضو کرنے کی حالت میں فالج گرا۔ عیادت کے لئے سارا شہر امنڈ پڑا مرید معتقدوں، عزیزوں دوستوں نے علاج وتیمارداری میں جان لڑا دی۔

حکیموں، ڈاکٹروں نے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا۔ لیکن نوشتہ الٰہی بہرحال پورا ہوا۔ ۱۹ر جنوری کو ۱۱ بجے شب کے وقت یہ شمع اتحاد جو سارے ملک ہند میں اُجالا پھیلائے ہوئے تھی ہمیشہ کے لئے گل ہوگئی اور لکھنؤ کی جیتی جاگتی محفل کو بالکل ہی سونا کرگئی۔ جنازہ کا اژدہام کچھ نہ پوچھئے خدا معلوم خلقت کہاں سے ٹوٹ پڑی تھی۔ ہزارہا مخلوق کاندھا دینے سے محروم رہ گئی۔ نماز دو دو بار پڑھائی گئی اور جس چارپائی پر نعش تھی اسے تو تار تار کرکے لوگ تبرک بناکر لیگئے۔ خاندانی قبرستان ملا انوار کے باغ میں سنگ مرمر کا مختصر سا مزار آج بھی عجیب دلکشی رکھتا ہے۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

(۲۴) توبۃ النصوح[1]

یہ نصوح وہ نہیں، جن کی توبہ کا ذکر مولانائے روم نے آج سے سات صدی قبل اپنی مثنوی میں فرمایا ہے۔ ع

بود مردے پیش ازیں نامش نصوح

بلکہ یہ نصوح آپ کے ہم وطن تھے، خاص اس دیس کی راجدھانی شہر دہلی کے رہنے والے۔ اور انھیں زمانہ بھی کچھ ایسا زائد نہیں گزرا۔ عجب نہیں جو ہمارے آپ کے دادا نانا کے ہم عصر ہوں۔ کل اسّی بیاسّی ہی برس تو ہوئے —— واقعی گوشت و پوست کے بنے ہوئے اس نام کے اور ایک خاص حلیہ کے کوئی صاحب تھے بھی یا نہیں، یہ بحث تو مورخ و سوانح نگار کے لئے چھوڑیئے۔ ادب کا طالب علم اور کتاب کا تبصرہ نگار تو بس اتنا جانتا ہے کہ دہلی کے ایک ادیب و فسانہ نگار اور واعظ شمس العلماً ڈاکٹر نذیر احمد نے ان نصوح کی تخلیق ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ کی تھی۔

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ ۱۴؍ دسمبر ۱۹۵۰ء کی شام کو۔ وقت: ۱۵ منٹ۔ (بہ سلسلۂ "نقاد کہتے رہے")۔

اور اتنا جان لینا کافی ہے اس کہانی کے سُننے والوں کے لئے بھی اور سُنانے والوں کے لئے بھی۔ یہ نصوح ایک اچھے خاصے کھاتے پیتے خوش باش شہری تھے۔ بیوی بچوں والے اور ادھیڑ عمر کے۔

ایک بار کیا ہوا کہ شہر میں ہیضہ کا زور ہوا۔ لوگ تابڑ توڑ مرنے اور گزرنے لگے۔ دوائیں اور تدبیریں رکھی کی رکھی رہ گئیں۔ مرض کا حملہ میاں نصوح پر بھی زور کا ہوا۔ حالت بگڑی اور لوگ مایوس ہو گئے۔ ڈاکٹر نے نیند کی دوا دی اور ان پر مدہوشی کا عالم طاری ہو گیا۔ اس حالت میں اپنے کو دیکھتے کیا ہیں کہ اس دنیا سے گزر کر عالمِ بالا میں پہونچ چکے ہیں اور اعمال کی پرسش ہو رہی ہے۔ آخرت کا یہ منظر، خواب و خیال میں سہی بہرحال قیامت کا منظر ہے، اور ادب میں مثنوی زہرِ عشق میں نواب مرزا شوق کی ترادوش فکر "وصیت نامہ" کا جواب۔ نقشہ نذیر احمد کے قلم نے اس درجہ موثر اور دل ہلا دینے والا پیش کیا ہے کہ تندرست اور ہٹا کٹا جوان بھی غیر متاثر نہیں رہ سکتا، چہ جائیکہ نصوح جو ضعف اور بیماری سے گھل کر نیم جان ہو ہی چکے تھے۔ جب آنکھ کھلی تو دل سے اپنی بے عملی پر نادم اور بدعملی سے تائب تھے اور اپنی اور اپنے والوں کی زندگی کے اصلاحی انقلاب پر پکے ارادے اور اٹل فیصلہ کے ساتھ کمر بستہ۔ غفلت اور سرشاری کی جگہ اب عقل کی بیداری اور روح کی سرگرمی نے لی۔ اصلاح پہلے اپنی کی۔ پھر اپنی شریک زندگی بی فہمیدہ کی کی۔ لڑکیاں دو تھیں اور لڑکے تین۔ ان میں سے چھوٹی لڑکی اور چھوٹے لڑکے کو تو جلد ہی درست کر لیا۔ منجھلا لڑکا بھی قابو میں آ گیا۔ ٹیڑھی کھیر دو اولادیں ثابت ہوئیں، ایک بڑی اور شادی شدہ لڑکی نعیمہ۔ دوسرے جوان جہان صاحبزادے کلیم۔ سب سے زیادہ دلچسپ۔ مفصل

اور عبرت آموز سرگزشت انھیں میاں کلیم کی ہے۔ اور نذیر احمد کے قلم کا اصل جوہر انھیں کی کردار نگاری میں چمکا ہے۔ باپ نے بار بار بلا بھیجا، مگر یہ صاحبزادے ایسے سعید تھے کہ گئے تک نہیں، اور اس کے بعد باپ نے جو پند نامہ اور ملامت نامہ لکھا، بس اسی کو بہانہ بنا، اپنی شاعری اور شوقین مزاجی کی ترنگ میں آ، گھر سے باہر نکل کھڑے ہوئے۔

اب نصوح نے ان کمروں کی تلاشی لینی شروع کی۔ اور چلئے ہم آپ بھی تلاشی کے گواہ بن جائیں۔ کمرے دو ہیں۔ ایک عشرت منزل یا آج کی زبان میں ڈرائنگ روم۔ دوسرا خلوت خانہ یا حال کی بول چال میں بڈ روم پہلے عشرت منزل ہی پڑتا ہے۔ کمرہ کیا تھا۔

"ایک تکلف خانہ تھا۔ کمرے کے بیچ میں چوکیوں کا فرش اسپر دری۔ اسپر سفید چاندنی اس خوش سلیقگی کے ساتھ تنی ہوئی کہ کہیں دھبے یا سلوٹ کا نام نہیں صدر کی جانب گجرات کا نفیس قالین بچھا ہوا، گاؤ تکیہ لگا ہوا، سامنے اُگالدان۔ لب قالین پیچوان۔ چوکیوں کے گرداگرد کرسیاں، تھیں تو لکڑی کی، لیکن آئینہ کی طرح صاف اور چمکتی ہوئی۔ چھت میں بٹا بٹی کی گوٹے کا پنکھا لٹکا ہوا، اس کے پہلوؤں میں جھاڑ۔ جھاڑوں کے بیچ میں رنگا رنگ کی ہانڈیاں، چھت کیا تھی، بلا مبالغہ آسمان کا نمونہ تھا، جس میں پنکھا بجائے کہکشاں کے تھا، جھاڑ بمنزلہ آفتاب اور ماہتاب، اور ہانڈیاں ہو بہو جیسے ستارے۔ چھت کے مناسب حالت دیواریں، تصویروں اور قطعات اور دیوارگیریوں سے آراستہ تھیں...... مقابل صدر کی جانب آمنے سامنے دو میزیں لگی ہوئی، ایک پر گنجیفہ، شطرنج،

چوسر، تاش، کھیل کی چیزیں اور ارگن باجے رکھے ہوئے۔ دوسری پر گل دان اور عطردان وغیرہ کے علاوہ ایک نہایت عمدہ طلائی جلد کی موٹی سی کتاب، تصویروں کا البم، مگر تصویریں کسی عالم، حافظ، درویش، خدا پرست کی نہیں، کھوابھاؤجی، تان رس خاں گویا۔ میر ناصر احمد بین نواز، صمد خان پہلوان، کھلونا بھانڈ، حیدر علی قوال، نتھو ہیجڑا، قاری علی محمد پھکڑ، مدو جواری اس قسم کے لوگوں کی...... دیوار والی تصویریں تو اور بھی بیہودہ۔"

دنیا نے ۱۸۸۰ء میں اتنی ترقی کہاں کی تھی کہ ایکٹرسوں اور فلم اسٹاروں کی تصویریں، غسل اور پیراکی کے لباس والیوں کے فوٹو، اور BEAUTY QUEENS (حسن کی ملکاؤں) کے مرقعے، اس نگار خانے میں موجود ہوتے۔ بہرحال جو فرنیچر اور جو سامان آج سے اسّی سال قبل کی روشن خیالی اور آرٹ نوازی کے لئے مایۂ زینت ہو سکتا تھا، کمرہ عشرت منزل اس سے مکمل طور پر آراستہ تھا۔ لیکن لیجئے اسی ایک کمرہ کا جائزہ لینے میں اتنی دیر ہو گئی، کہ خلوت خانہ کی سیر کا وقت ہی نکلا جاتا ہے۔ خیر ایک اچٹتی سی سرسری نظر اس پر بھی سہی۔ یہاں ایک الماری کتابوں کی تھی۔ کتابیں ظاہر کے اعتبار سے ہر صناعی اور ہنرمندی کا نمونہ لیکن

"معنی و مطلب کے اعتبار سے ہر ایک جلد سوختنی اور ردیدنی...... جھوٹے قصے، بیہودہ باتیں، فحش مطلب، لچے مضمون، اخلاق سے بعید، حیا سے دور۔"

نصوح نے کیا کیا کہ "بھری الماری کتابیں لکڑی اور اپلے کی طرح اوپر تلے رکھ کر آگ لگادی" اور دم کے دم میں کلیات آتش کو دہکتی آگ اور

دیوان خسرو کو جلتے انگاروں اور روا سوخت امانت کو آتش سوزاں کے سپرد کر دیا"
——— آج کے اہل بزم ان کتابوں کے نام پر کچھ زیادہ حیران اور چوکنا نہ ہوں۔ وقت کا معیار ثقاہت و متانت یہی تھا۔

کلیم بیچارہ شامت کا مارا شعر و شاعری کے نشہ میں دھت، خود بینی و خود پسندی کی شراب سے مست، رات کے وقت گھر سے نکلا تو سیدھا اپنے بے فکرے دوست، مرزا ظاہر دار بیگ کے ہاں پہنچا۔ یہ حضرت اسم با مسمیٰ تھے، ظاہرداری کے فن میں طاق، ڈھول کی رسی بٹنے کے کمال میں مشاق۔ ان کی چھب تختی بھی قابل دید ہے۔ مزہ داری میں نواب مرزا شوق کی مثنویوں کی چھری کی کنگھی چوٹی سے کم نہیں۔

"جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیہ کی جوتی، سر پر آڑی بیل کی کامدانی ٹوپی، بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے، اوپر شبنم یا ہلکی تنزیب، نیچے کوئی طرحدار ساڈھا کے کا نینو خیر یہ تو صبح شام اور تیسرے پہر کا شانی مخمل کی آصف خانی جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی۔ سرخ نیفہ، پاجامہ اگر ڈھیلے پائچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے۔ اور اگر تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر جلد بدن کی طرح مڑھا ہوا۔ ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا۔ اور اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض جب دیکھا تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا نے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔"

یہ مرزا اپنی امارت کے خوب ہوائی قلعے بناتے اور کلیم پر اپنی دھونس

جماتے رہتے۔ کلیم بھولا بھالا بھی ان کی لن ترانیوں میں آگیا تھا۔ پہونچا سیدھا ان کی حویلی پر۔ معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کی دولت سرا اس حویلی کے پچھواڑے ہے۔ ایک تو اُپلوں کی ٹال کے پاس ایک چھوٹا سا مکان اور وہ بھی کچا۔ آواز سُن کر مرزا ننگ دھڑنگ جانگھیہ پہنے باہر تشریف لائے اور معاً بولے کہ بندہ کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ کلیم بولے کہ میں تو آپ کے پاس رات کو رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔ مرزا نے برجستہ کہا کہ چلئے اس مسجد میں تشریف رکھئے نہ۔ بڑی فضا کی جگہ ہے اب اس مسجد کا نقشہ نذیر احمدی انشا میں:۔

"ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد، وہ بھی مسجد مزار کی طرح ویران، وحشت ناک نہ کوئی حافظ نہ کوئی ملا۔ ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے۔"

مرزا کلیم کو یہ بتادے کر کہ گھر میں علالت شدید ہے خود رفوچکر ہو گئے اور بڑی دیر کے بعد جب لوٹے تو کلیم کا یہ حال کہ طبیعت اندھیرے سے متوحش۔ لیکن چراغ کی فرمائش پر مرزا صاحب کا یہ برجستہ فقرہ کہ

"چراغ کیا میں نے تو لیمپ روشن کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن گرمی کے دن ہیں، پروانے بہت جمع ہو جائیں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جیے گا اور ابابیلوں کی کثرت ہے، روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہو جائیں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔"

کلیم غریب بھوک کی شدت سے الگ بے حال ہو رہا تھا، اور زبان کو توفیق

تو کیا ہوتی، لیکن آنتیں برابر قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ منہ پھوڑ کر کھانے کی فرمائش کی ــــــ مرزا نے کیا خوب لقمہ دیا:۔

"مرد خدا تو آتے ہی کیوں نہ کہا، اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے۔ دوکانیں سب بند ہو گئیں، اور جو دو ایک کھلی بھی ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے۔ گھر میں آج آگ تک نہیں سلگی، مگر ظاہر ہے تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل ــــــ ہے۔ دیو اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے، ایک تدبیر سمجھ میں آئی کہ جاؤں چھدامی بھڑ بھونجے کے ہاں سے گرم گرم خستہ چنے کی دال بنوا لاؤں، بس ایک دھیلے کی مجھ کو تم کو دونوں کو کافی ہو گی"

خیر صاحب وہ دھیلے کے گرما گرم چنے لے آئے۔ لیکن اُن کی شان نزول میں جو تقریر دلپذیر مرزا کے کام و دہن سے ارشاد ہوئی، وہ عجب نہیں جو چھدامی بھڑ بھونجے کو اردو ادب کی دنیا میں زندہ جاوید بنا دے۔

"یار ہو تم خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ، دیکھو کیسے جھلس رہے ہیں اور سوندھی خوشبو بھی عجب ہی دلفریب ہے جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہ ہوا۔ کوئی فن سہی کمال بھی کیا چیز ہے دیکھئے اتنی تو رات گئی ہے مگر چھدامی کی دوکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے، بندہ نے بتحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دوکان کا چنا بلا ناغہ لگ کر جاتا ہے، اور واقع میں ذرا آپ غور سے دیکھئے، کیا کمال

کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمہیں میرے سر کی قسم سچ کہنا، ایسے خوبصورت، خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے؟ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں ہے، ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور۔ اور دانوں کی رنگت دیکھئے کوئی بسنتی ہے کوئی پستئی، غرض دونوں رنگ خوش نما۔"

مولانا کا قلم مسرت و انبساط ہی کی منظر نگاری کا دھنی نہیں، غم و حسرت، حزن و ملال، عبرت و موعظت کی بھی مرقع کشی میں ویسا ہی برق ہے۔ نصوح کا خواب تو اثر اندازی اور عبرت انگیزی میں اپنی مثال آپ ہی ہے، لیکن کلیم جب لٹ لٹا کر رات کو کوتوالی میں بند ہوا ہے اور بعد نماز فجر دو سپاہیوں کی حراست میں تحقیق حال کیلئے نصوح کی خدمت میں لایا گیا ہے اور اس کی آنکھیں ایک طرف باپ سے چار ہوئی ہیں اور دوسری طرف ان نمازیوں سے جو ابھی کل تک اس کی نظر میں حقیر و ذلیل، "قل اعوذیئے" اور "مردہ شو" اور "ٹکڑ گدے" تھے، تو وہ منظر بھی اردو ادب کے موثر و دلگداز نمونوں میں مستقل جگہ پانے کے قابل ہے۔ اقتباس پر اقتباس کہاں تک دیئے جایئے اور کلیم کی ٹریجڈی یا داستان درد کو کہاں تک سمیٹئے اور کہاں تک پھیلاتے چلے جایئے۔ ع

وقت کوتاہ قصہ طولانی

کلیم کی بقیہ سرگزشت کا ایک ایک جزو، لفظ و معنی، ادب و اخلاق ہر اعتبار سے پڑھنے کے قابل ہے، خصوصاً کلیم کی رئیس دولت آباد کے دربار میں حاضری اور اس موقع پر نائب صاحب سے پُرلطف، دل آویز اور سبق آموز سوال و جواب اور پھر اس دردناک افسانے کی تمت بالخیر۔ لیکن اب جس کسی کو یہ شوق پورا کرنا ہو

وہ ... اصل کتاب ہی کا مطالعہ کرے۔

خاتمہ سے قبل بس ایک بات اس بے علمے نقاد کی زبان سے اور سن لیجئے نذیر احمد زباندان تو خیر تھے ہی، ساتھ ہی زبان آور بھی تھے زباندانی کے نمونے آپ دیکھ چکے، اب زبان آوری کا بھی ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو اور اس کے بعد، نصوح کے خالق کاغذی کے حق میں فاتحہ خیر کیلئے ہاتھ اٹھا دیجئے۔

موقع یہ ہے کہ ایک جگہ ایک بے دین یا بے خدا شخص سے گویا مولانا کی مڈبھیڑ ہوگئی ہے۔ مارے پھبتیوں کے اُسے بولا دیا ہے :۔

"بے دین آدمی ایسا ہے، جیسا بے نکیل کا اونٹ، بے ناتھ کا بیل، بے لگام کا گھوڑا، بے ملاح کی ناؤ، بے ریگولیٹر کی گھڑی، بے شوہر کی عورت، بے باپ کا بچہ، بے لالی کی مہندی، بے خوشبو کا عطر، بے باس کا پھول، بے طبیب کا بیمار، بے آئینہ کا سنگھار، یعنی دین نہیں تو دنیا و مافیہا سب ہیچ، اور عبث اور فضول اور پوچ اور لچر۔"

(۲۵) اُمراؤجان ادا

چوک کے بالاخانوں پہ کمرہ لے کر بیٹھنے والیاں، اپنی عصمت وناموس کی تجارت کرنے والیاں اس قابل کب ہیں کہ ان کا ذکر شریفوں کی بھائی برادری میں کیا جائے؟ چہ جائیکہ ان ناشدنیوں کے حالات پر کتابیں لکھی جائیں، انھیں چمکایا جائے، پھیلایا جائے! — اور پھر یہ حال تو آج ہے، بیسویں صدی کے وسط میں، آج سے پچاس پچپن برس قبل بھلا کس کی مجال تھی جو ایسی جرأت کرتا، اور بیٹھے بٹھائے مفت میں نکّو بنتا! آفرین ہے مرزا محمد ہادی لکھنوی ملقّب بہ مرزا رسوا کو کہ ایسی بیش قدمی اس وقت کر ڈالی اور اپنے حساب تو اپنے کو رسوا ہی کر گئے۔

امراؤجان ادا کی تصنیف کا زمانہ انیسویں صدی کا دور آخر دہے جب ملک میں طوطی شرر صاحب کے تاریخی ناولوں کا بول رہا تھا، اور نذیر احمد کے ناول نما افسانے تو تمام تر اخلاقی پند نامے ہوتے تھے لے دے کے ایک سرشار ایسے تھے جو اپنے ناظرین با تمکین کو سیر چوک اور نخاس:

لہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ ۲۸ر دسمبر ۱۹۵۰ء کی شام کو۔ وقت: ۱۵ منٹ۔

امین آباد اور حضرت گنج کی کرادیتے، اور شرابیوں، کبابیوں، جواریوں کی جمگھٹ میں لا کھڑا کرتے۔ لیکن یہ سرشار بھی باوجود اپنی رندی و سرمستی کے تھے اتنے باادب و ہوشیار کہ جب ساقی نامہ پر طبع آزمائی فرماتے تو اگر پہلا مصرعہ یہ لاتے۔ ع

پلا ساقیا مالوے کی افیم

تو اس نشہ میں بھی گلگشت جنت ہی کی سوجھتی، اور قافیہ یوں لاتے۔ ع

کہ ہو جس سے گلگشت باغ نعیم

تو متانت و ثقاہت کی اس فضا میں یہ مرزا ہی کا دل و جگر تھا کہ ایک اونچی ڈیرہ دار کی کہانی اسی کی زبانی سنادی اور کچھ کم دو سو صفحہ کی کتاب میں ایک سطر بھی ایسی نہ آنے دی جو مذاق سلیم پر بار ہو۔ اور حضرت محتسب کی خاطر عاطر کو ناگوار ہو! کہانی آپ بیتی یا خود گزشت ہے اور طوائف کی ہے کہ جب اپنی بھر پور جوانی کی سرگزشت سنانے پر آئے گی تو کیا کوئی بات اٹھا رکھے گی۔ ناچ مجرے کی گرما گرمیاں، آشناؤں قدردانوں کی آمد ورفت، گوتیوں، ڈھاڑیوں، سازندوں کی تعلیمیں، ہمجولیوں سے ہنسی چہلیں، نوابوں، رئیسوں سے راہ و رسم۔ درباروں سرکاروں سے توسّل، رشک و رقابت کی نوک جھونک، تماش بینی کے آداب و دستور، تماش بینوں کی نیتیں اور علتیں، غرض سارے اُتار چڑھاؤ اپنی اپنی جگہ موجود لیکن قلم کی شرافت کاری سب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے! نکتہ چیں عموماً کم بیں ہوتے ہیں اور اور پھر لکھنؤ کے نقاد کیا کسی کو چھوڑتے ہیں، جب میر و مرزا کو نہ چھوڑا تو اور کسی کو کب بخشتے ہیں۔ لیکن یہ رودادِ زندگی دلوں کو کچھ ایسی بھائی اور دماغوں میں ایسی سمائی کہ نہ کوئی زبان حرف گیری پر کھلی اور نہ کسی کے

جبین احتساب پر شکن پڑی۔ شروع کے چند سال تو کچھ سرد مہری اور بے التفاتی سی رہی، اس کے بعد دلی کے ایک اہل زبان نے عین اسی رنگ میں شاہد رعنا وغیرہ ناول پیش کرنے شروع کر دیئے اور پھر مصنف کی وفات پر جب اس کم سواد بے استعداد نے ان ناولوں کا تعارف ہندوستانی اکیڈمی کے رسالہ ہندوستانی کے صفحات میں کرایا تو گو ایک دنیا مشتاق ہو کر ٹوٹ پڑی۔ مقالہ خدا جانے کتنے ہفتہ واروں اور روزناموں میں نقل ہوتا رہا اور امراؤ جان ادا تو اس کے معاً بعد ایک یونی ورسٹی کے ایم۔ اے کے اردو کورس میں داخل ہو گئی۔

یہ امراؤ جان ادا کوئی پیدائشی بیسوا نہ تھیں۔ اودھ کا پرانا دارالسلطنت فیض آباد ہے۔ اور اس کو کسی زمانہ میں شہر بنگلہ بھی کہتے تھے (شاید اس مناسبت سے کہ نواب اول سعادت خان برہان الملک نے اپنے لئے یہاں ایک بنگلہ لکڑی کا تیار کرایا تھا) فیض آباد کا ادب اور موسیقی سے جو لگاؤ ہے اس کا ظہور میر انیس کے وقت سے آج تک ہو رہا ہے۔ یہ مسماۃ وہیں پیدا ہوئیں، ایک خاصے بیتے گھر گرہست خاندان میں نوابی کا زمانہ بردہ فروشی کا چلن۔ کوئی ظالم گھر سے بہلا پھسلا نوریس کی بچی امیرن کو لکھنؤ لا چوک کی ایک مشہور نائکہ کے ہاتھ بیچ گیا۔ اور اس ماحول میں امیرن، امراؤ جان بن گئیں۔ اپنے پیشہ میں خوب بڑھیں، خوب چمکیں، خوب پھلیں۔ نستعلیق، پڑھی لکھی، شائستہ، باذوق تھیں ہی، شعر و شاعری کرنے لگیں اور اداؔ تخلص رکھ لیا۔

کتاب ان کے کلام کے نمونوں سے بھری پڑی ہے اور کلام ان کا کیوں کہیے، خود مرزا صاحب کا ہے، یہ بھی عجب مذاق تھا۔ کہتے خود گئے" اور

تخلص ادا کا ڈالتے گئے۔ نمونہ آپ بھی سننا چاہتے ہیں ملاحظہ ہو:-

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے　　دیکھئے دیکھئے اک آن میں کیا ہوتا ہے
بت پرستی میں نہ ہوگا کوئی مجھ سا بدنام　　جھینپتا ہوں جو کہیں ذکر خدا ہوتا ہے
عشق میں حسرت دل کا تو نکلنا کیسا　　دم نکلنے میں بھی کمبخت مزا ہوتا ہے
تالب گور پہونچ جاتے ہیں مرنے والے　　وہ بھی اسوقت کہ جب شوق رسا ہوتا ہے
آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شرربار کہوں　　ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے
کس قدر معتقد عشق مکافات ہوں میں　　دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے
شوق اظہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ　　اسی آئینہ میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

چھوٹی رواں بحروں میں بحر طبع کی روانی کا کیا پوچھنا ؎

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی　　اسی کافر کی ادا یاد آئی
ہجر کی رات گزر ہی جاتی　　کیوں تری زلف رسا یاد آئی
لذت معصیت عشق نہ پوچھ　　خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی
تم جدائی میں بہت یاد آئے　　موت تم سے بھی سوا یاد آئی
چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا　　لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

ایک اور غزل کے گنتی کے ۵ شعر اور سن لیجئے ؎

شب فرقت بسر نہیں ہوتی　　نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی
جان دینا کسی پہ لازم تھا　　زندگی یوں بسر نہیں ہوتی
ہے یقیں وہ نہ آئیں گے پھر بھی　　کب نگہ سوئے در نہیں ہوتی
ہم اسیران عشق کو صیاد　　ہوس بال و پر نہیں ہوتی
غلط انداز ہی سہی وہ نظر　　کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی

کتاب بھر میں اور کچھ نہ ہوتا، بس یہی دو چار غزلیں ہوتیں جب بھی

اہل ذوق کتاب کو سینہ سے لگا کر رکھتے۔ لیکن یہاں تو اچھا خاصا ذخیرہ اسی رنگ کے کلام کا موجود ہے۔

اب رہی نثر، تو مرزا صاحب کی زبان خود ہی ایک معیار اردو زبان کی صحت، شستگی و فصاحت کا ہے۔ ان کا روزمرہ خالص لکھنؤ کا روزمرہ، اور ان کی بول چال سو فی صدی ٹکسالی ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ میر انیس تک کو سند نہیں مانتے تھے۔ اتنا انھیں اعتماد اپنی زبان پر تھا۔ اور ان کی زبان کے جوہر جن تین ناولوں میں سب سے زیادہ کھلے اور چمکے ہیں وہ ذات شریف اور افشائے راز کے علاوہ امراؤ جان ہیں۔ ان کا فن منتہائے کمال کو اسی کتاب میں پہونچا ہے۔ اور تکمیل فن میں ان کی نظر سب سے بڑھ کر روزمرہ کے پہلو پر تھی۔ لکھنؤ کے ادیبوں، منشیوں اور انشا پردازوں کی جو زبان ہے وہ تو بہت سی کتابوں میں مل جاتی ہے، لیکن جسے لکھنؤ کا روزمرہ کہئے یا وہ زبان جو لکھنؤ والوں کے گھروں میں بولی جاتی ہے۔ اس کے نمونے انی گنی صرف چند کتابوں میں نظر آئیں گے، اور ان چند میں ایک امتیازی مرتبہ پر امراؤ جان ہے۔

زبان کے پہلو کو چھوڑ کر حکمت و معنویت کے رخ پر آئیے تو کتاب نفس بشری سے متعلق نکتوں اور حقیقتوں سے مالا مال ملے گی۔ لیکن سب وہی اشارے کنائے ہیں۔ یہ خیال بھی کہیں نہ گزرے گا کہ کوئی درس حکمت و معرفت کا دیا جا رہا ہے۔ سارے حقائق و معارف کے لئے انداز بیان جو اختیار کیا گیا ہے وہ حد درجہ سادہ اور بے ساختہ، ہلکے پھلکے فقرے، نرم شیریں، رسیلی عبارتیں، نہ کہیں اصطلاحات کا ثقل، نہ کہیں اوق لغات کے پتھر، اور نہ کہیں مغلق اور پیچدار ترکیبوں کا بار۔

ایک آدھ مثال آپ سُن لینا چاہتے ہیں؟ لیجئے۔ بچپنے کی سائیکالوجی۔ امراؤ جان اپنے بچپن کا حال بیان کرتی ہیں "اماں چھوٹے بھیا کو بہت چاہتی تھیں، چھوٹے بھیا کے لئے میں نے بہت مار کھائی مگر پھر بھی مجھے اس سے انتہا کی محبت تھی۔ اماں کی ضد سے تو میں نے دو دو پہر گود میں نہیں لیا، مگر جب ان کی آنکھ اوجھل ہوئی فوراً گلے سے لگا لیا، گود میں اٹھا لیا۔ پیار کر لیا جب دیکھا اماں آتی ہیں، جلدی سے اُتار دیا۔ اب وہ رونے لگا اس پر اماں سمجھتی تھیں کہ میں نے رولا دیا لگیں گھڑکیاں دینے"۔

ایک اور موقع۔ امراؤ جان اب اپنے پیشہ میں بڑا نام پیدا کر چکی ہیں۔ اور لکھنؤ چھوڑ کر اپنے وطن پیدائش فیض آباد آئی ہیں ایک روز ایک صاحب ادھیڑ عمر کے ان کے کوٹھے پر آتے ہیں اور باتوں باتوں میں پتہ چلتا ہے کہ بہو بیگم کے عزیزوں اور وثیقہ داروں میں ہیں۔ امراؤ جان کے باپ اسی بہو بیگم کے مقبرہ میں جمعدار تھے۔ دل میں قدرتاً خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان صاحب سے اپنے والد کی خیریت دریافت کی جائے۔ لیکن مرزا صاحب اس وقت امراؤ جان کی زبان پر براہ راست یہ سوال بالکل نہیں آنے دیتے وہ گھوم گھام کر مقبرہ کا ذکر نکال رہی ہیں، وہاں کے ملازموں کی بابت دریافت حال کر رہی ہیں۔ لیکن چٹ سے یہ سوال نہیں کر دیتیں کہ وہ بوڑھے جمعدار روشنی کے مہتمم کیسے ہیں۔ دل جو دھڑک رہا ہے کہ خدا معلوم کیا سُننے کو ملے۔ آخر خود انھیں صاحب کی زبان سے نکل گیا کہ وہ "جمعدار تو غدر سے پہلے ہی مر گئے، اب ان کا لڑکا ان کی جگہ پر ہے"۔ اور یہ سنتے ہی گویا ایک برچھی امراؤ جان کے پار ہو گئی۔

ایسے ایسے نفسیاتی چٹکلے، کتاب بھر میں بکھرے پڑے ہیں اور عجب نہیں

جو اس کتاب کو بڑی طویل زندگی بخش دیں ــــــ ایسے چٹکلے جیسے اکبر الہ آبادی کے شعر میں ملا کرتے ہیں۔

گفتگو ختم ہونے سے قبل ایک لطیفہ سُن لیجئے۔ ناول پڑھ کر لکھنؤ کے کسی طبیعت دار منچلے نے مرزا صاحب کو خط لکھا کہ "حضرت اپنی امراؤ جان سے ہمارا بھی تعارف کرا دیجئے"۔ مرزا صاحب کیا چوکنے والے تھے جواب دیا کہ "امراؤ جان تو غدر سے پہلے جوان ہو چکی تھیں آج زندہ ہوتیں تو آپ کی اماں جان سے بھی بڑی ہوتیں، اور میں بڑی خوشی سے ایسے سعادتمند فرزند کو ان سے ملا دیتا"۔

صحیح کردار نگاری اور ماحول کی صحیح مرقع کشی کے لحاظ سے کتاب اپنی نظیر آپ ہے۔ اور درد انگیزی کے لحاظ سے بعض بعض ٹکڑے تو انتہائی موثر ہیں۔ مثلاً وہ دونوں موقع، جہاں امراؤ جان پہلے اپنی ماں سے ملتی ہیں اور پھر اپنے بھائی سے۔ دونوں سے ملاقات کا رنگ دونوں موقعوں کے تاثرات بالکل جدا گانہ ہیں۔ اور یہ مصنف کی حکیمانہ افسانہ نگاری کے آیات کمال میں سے ہے۔

غزل میں ایک خاص چیز غزل کا مقطع ہوتا ہے اور اکثر اُستاد اپنی استادی کا کمال اسی میں دکھاتے ہیں۔ کتاب کا سب سے آخری پیرا گراف حاصل کتاب ہے۔ حکمت و دانش کا عطر۔ سعدی شیرازی و اکبر الہ آبادی دونوں کی روح گویا کشید ہو کر آگئی ہے۔ امراؤ جان کا یہ آخری پیام اور وصیت ہے اپنی ہم پیشہ بدنصیب بہنوں کے نام۔ سُنئے۔

"اے بے وقوف رنڈی کبھی اس بھلاوے میں نہ آنا کہ کوئی تجھ کو سچے دل سے چاہے گا۔ تیرا آشنا جو تجھ پر جان دیتا ہے۔ چار دن کے بعد چلتا

پھرتا نظر آئے گا۔ وہ تجھ سے ہرگز نباہ نہیں کر سکتا۔ اور نہ تو اس لائق ہے۔ سچی چاہت کا مزا اسی نیک بخت کا حق ہے جو ایک کا منہ دیکھ کر دوسرے کا منہ نہیں دیکھتی۔ تجھ جیسی بازاری شفتل کو یہ نعمت خدا نہیں دے سکتا۔ خیر میری تو جیسی گزرنا تھی گزر گئی، اب میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ جے دن دنیا کی ہوا کھانا ہے کھاتی ہوں میں نے اپنے دل کو بہر طور سمجھا لیا ہے اور میری کل آرزوئیں پوری ہو چکیں۔ اب کسی بات کی تمنا نہیں رہی اگرچہ یہ آرزو کم بخت وہ بلا ہے کہ مرتے دم تک نہیں نکلتی مجھے اُمید ہے کہ میری سوانح عمری سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہو گا۔ اب میں اپنی تقریر کو اس شعر پر ختم کرتی ہوں اور سب سے امیدوار دعا ہوں ؎

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

———— -.☆.- ————

(۲۶) نیکی کر اور دریا میں ڈال[1]

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اقبال کے نام اور کلام سے ہم آپ میں کون ناواقف ہے! اور یہ شعر جو ابھی عرض کیا گیا انھیں جانے پہچانے اقبال کی ایک غزل کا ہے۔ غزل بہت پرانی اور ان کے بالکل شروع زمانہ کی کہی ہوئی۔ ہر شعر جیسے ہیرا یا موتی اور پوری غزل جیسے موتیوں کی لڑی۔ گویا آج کی گفتگو ہی کے لئے دماغ کی لوح سے اتر کر کاغذ کے صفحہ پر آئی ہوئی۔ مثلاً یہ ارشاد ؎

واعظ کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

یا یہ پکار کہ ؎

جینا وہ کیا کہ ہو نفس غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن یا شعبۂ ہندی کی طرف سے ۔ جون ۱۹۵۱ء کی شام کو۔
وقت: ۱۵ منٹ۔

لیکن سب سے بڑھ چڑھ کر وہی شعر جو شروع میں عرض ہوا کہ

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنّا بھی چھوڑ دے

شاعر کا کمال یہ ہے کہ یہاں جو کچھ کہنے سننے میں ۱۴۔۱۵ منٹ لگیں گے، اس کو اس نے سمیٹ کر آدھے منٹ میں ادا کر دیا دریا کو کوزہ میں بند کر دینا اسی کا نام ہے۔

"نیکی کر دریا میں ڈال" بہ ظاہر ایک عجیب سی ہدایت معلوم ہوتی ہے لیکن ذرا کی ذرا اگر نیکی کے مفہوم و حقیقت پر غور کر لیا جائے۔ تو بات بالکل صاف اور سیدھی نظر آنے لگتی ہے۔ تنکے کے اوٹ پہاڑ ہے ــــــ نیکی نام کسی مادی، خارجی، مجسم چیز کا نہیں۔ جس طرح بدی بھی کسی ایسی خارجی چیز کا نام نہیں۔ بلکہ انسان کو جو قوتیں فطرت کی طرف سے عطا ہوئی ہیں۔ ان کا صحیح، معیاری، صحت مندانہ استعمال ہی نیکی ہے (جس طرح اس کے برعکس ان کا غلط، مریضانہ، (استعمال بدی)۔ اس کارخانہ عالم کو اگر کسی نے اندھے کی لاٹھی اور بالکل بے مقصد سمجھ لیا ہے۔ تو اس سے گفتگو تو کسی اور موقع پر کی جائیگی لیکن اگر یہ دنیا اور اس کے سارے موجودات کچھ مقصد و غرض رکھتے ہیں جیسا کہ ہندو، مسلمان، بودھ، مسیحی، سکھ اور پارسی سب ہی مانتے چلے آئے ہیں۔ تو یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ انسان سرآمد کائنات ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی مقصد اور بہت بڑا مقصد اپنے وجود کا رکھتا ہے اور اس کو جسم و روح۔ عقل و ہوش۔ دل و دماغ کی جتنی بھی قوتیں عطا ہوئی ہیں سب اسی مقصد کو انجام تک پہنچانے کے لئے ملی ہیں۔ اور نیکی یا عبادت یہی ہے کہ انسان اپنی ہر خداداد قوت کو اس کے صحیح مصرف میں یعنی خدا کے بتائے ہوئے

مصرف میں لائیے۔ کھانا اگر آپ بھوک لگنے پر اور ضرورت کے اندازہ کے موافق کھا رہے ہیں۔ تو یہ اپنے نفس کا حق ادا کرنا ہوا۔ اور اپنی ذات کے ساتھ نیکی۔ علم کی دولت اگر آپ کے پاس ہے تو اس سے دوسروں کو نفع پہنچانا۔ انھیں پڑھانا بتلانا۔ سکھانا سب اسی علم کا حق ادا کرنا اور اپنا فرض ادا کرنا ہوا۔ اس میں کسی دوسرے پر احسان رکھنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ تو اپنی شخصیت کی تکمیل کے لئے اپنے وجود کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہوا۔

اور جب نیکی کی یہ حقیقت ایک بار ذہن نشین ہو گئی تو اب وہ "دریا میں ڈالئے" والی ہدایت بھی روز روشن کی طرح صاف اور بے غبار ہو گئی۔۔۔ فرض کیجئے کہ آپ کے پڑوس میں ایک صاحب فاقہ سے ہیں اور آپ کے پاس فراغت کے ساتھ کھانے، پینے، دینے کو کئی کئی کھانے موجود ہیں۔ تو اب جس طرح اپنا فاقہ توڑنے اور اپنی جان کو زندہ سلامت رکھنے میں آپ کی امداد قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح آپ کی اپنی انسانیت کی تکمیل کے لئے اور اپنی حیات روحانی کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ آپ ان کی امداد کریں۔ اخلاص کے معنی بھی یہ ہیں کہ جو کچھ بھی کیا جائے، اپنے مالک و پروردگار کی رضاجوئی کے لئے ہو کہ اسی میں تکمیل اپنی عبدیت و بشریت کی ہوتی ہے۔ اور اسی سے 'قرب حق' کی منزلیں طے ہوتی ہیں۔ تو اگر کسی کے ساتھ سلوک کرتے ہوئے آپ کو خیال اس سے معاوضہ وصول کرنے کا آگیا تو یہ صاف سوداگری بلکہ سودا بازی ہو گئی۔ اور عبادت باقی ہی کہاں رہی! عبادت کا تو جوہر ہی اخلاص یا تعمیل ارشاد ربانی ہے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ نیک بندوں کے ذکر میں آتا ہے کہ یہ لوگ خدا کی

محبت میں مسکینوں کو اور یتیموں کو اور قیدیوں کو کھلاتے پلاتے رہتے ہیں اور کہتے رہتے ہیں کہ یہ ہم جو کچھ بھی تمہیں کھلا پلا رہے ہیں اس سے مقصود خدا کی رضا جوئی ہے۔ نہ کہ تم سے کسی طرح کا معاوضہ قبول کرنا، یا تمہیں احسان مند بنانا ——— اور اس مضمون کی یہی آیت نہیں، خدا معلوم کتنی مختلف آیتوں میں۔ کتنے مختلف طریقوں سے تاکید اسی مضمون کی آئی ہے۔ اور ہمارے رسول کی حدیثیں تو اس سے بھری پڑی ہیں۔ پیمبروں کا طریقہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ عبادت پر عبادت، نیکی پر نیکی کرتے گئے ہیں اور ساتھ ہی ڈرتے لرزتے بھی رہے ہیں کہ دیکھئے یہ نذرانے اخلاص کی بارگاہ میں قبول بھی ہوتے ہیں! اور یہی راہ ہمارے رسول کے رفیقوں اور دنیا جہان کے سارے اہل دل اور روحانیت والوں کی رہی ہے۔ یعنی خلق خدا کی خدمت، بے غرض اور بلا لحاظ معاوضہ۔

بائبل کے جو دو ٹکڑے ہیں ایک یہود کے لئے سند اور دوسرا عیسائیوں کا مستند۔ دونوں کے اوراق اسی آواز سے گونج رہے ہیں۔ اور آپ کی سرزمین ہند کی کتاب معرفت بھگوت گیتا کا تو پوچھنا ہی کیا۔ سری کرشن جی کی اسی تعلیم سے اول سے آخر تک لبریز ہے کہ جو کچھ کرو اپنا دھرم، اپنا فرض سمجھ کر کرو۔ اپنی ڈیوٹی کو ہر حال میں ادا کرتے رہنا ہی عبادت ہے۔ یہی عبادت ہے۔ یہی نیکی ہے۔ یہی جنّت کی راہ اور یہی روحانیت وسعادت کے تکملہ کی شاہراہ ہے ——— کتابوں اور آسمانی ہدایتوں کو چھوڑیئے۔ گاندھی جی کی زندہ کتاب زندگی تو ابھی کل تک ہمارے آپ کے سب کے سامنے کھلی ہوئی تھی۔ پھر اس کے ایک ایک ورق میں ایک ایک سطر میں کیا لکھا ہوا ملا۔ بجز اسی بے غرض، بے لوث خدمت خلق

مخلوق کے۔

سعدیؔ شیرازی کی بات کئی سو برس کی پرانی ہوگئی۔ لیکن ہے تو وہ بھی یہی جانی پہچانی ہوئی آواز ؎

طریقت بہ از خدمت خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

یعنی لباس اور ظاہری آداب و رسوم سے کیا ہوتا ہے۔ طریقت و معرفت کی کنجی تو بس اسی خدمت خلق میں ہے۔

انسان کی زندگی روح و مادہ کی ترکیب ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ دونوں جوہر جہاں بہت سی چیزیں مشترک رکھتے ہیں۔ وہاں اپنے بعض صفات و خصوصیات کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد بھی ہیں۔ جسم جس طرح اپنی بڑائی سے خوش ہوتا ہے۔ روح اس کے مقابل فنائیت کی طلب میں رہتی ہے۔ جسم کے مطالبے ہمیشہ پھیلنے پھیلانے کے رہتے ہیں۔ روح کے تقاضے اس کے برعکس سمٹنے سمٹانے کے۔ جسم شہرت و ناموری کا حریص ہے۔ روح کو گمنامی و بے نشانی عزیز ہے۔ جسم ہوس و اقتدار کا بھوکا۔ روح قناعت و انکسار کی دلدادہ۔ جسم کو لوٹنے میں لطف آتا ہے۔ روح کو لٹانے میں۔ جسم کو دوسروں سے کام لینے میں دوسروں کو اپنی خدمت میں لگانے میں مزہ آتا ہے۔ روح کو وہی لطف دوسروں کی خدمت کر دینے میں۔ دوسروں کے کام میں کام آنے سے ملتا ہے۔ ایک کی راہ اسراف کی دوسرے کی منزل ایثار کی ؎

صحتِ ایں حس بجوئید از طبیب — صحت آں حس بجوئید از حبیب

انسان کا نیکی پر آمدہ ہونا تمام تر اپنی روح ہی کے کسی تقاضہ یا مطالبہ کو پورا کرنا ہے۔ روحانیت کی تکمیل بغیر اس کے ہو نہیں سکتی کہ کوئی حاجتمند

ایسا ہو جس کی حاجت پوری کی جائے۔ کوئی مظلوم ایسا ہو جس کی داد رسی کی جائے۔ کوئی زخمی ایسا ہو جس کی مرہم پٹی کی جائے۔ کوئی گرا ہوا ہو جسے زمین سے اٹھایا جائے۔ کوئی روتا ہوا ہو جس کے آنسو پونچھے جائیں۔ یہ سارے کام روح کی غذا کا کام دیتے ہیں۔ انھیں انجام دیئے بغیر روح ویسی ہی مردہ نیم مردہ یا مضمحل رہے گی جیسے غذا پائے بغیر جسم ـــــــ تو جس طرح کھانے پینے سے انسان کسی پر احسان نہیں کرتا بجز اپنے ایک لازمی جسمانی مطالبہ کے پورا کرنے کے۔ ٹھیک اسی طرح کوئی سی بھی نیکی کر کے انسان کسی دوسرے پر احسان نہیں کرتا۔ بجز اپنے ایک روحانی تقاضہ کے پورا کرنے کے۔

بات بالکل صاف اور سیدھی ہے کاش ہم سب کی سمجھ میں آجائے۔ اور ہمیشہ یاد رہے! بات ختم ہونے سے پہلے ایک چھوٹی سی بات اور سن لیجئے۔ جنگ عظیم سے کچھ دن پہلے ایک نامور ہندوستانی طالب علم جرمنی گئے ہوئے تھے اتفاق کی بات کہ اجنبی شہر میں خاصی رات گئے پہنچے۔ گلی کوچہ سے بالکل ناواقف ریل ہی سے ساتھ ایک جرمن کا ہو گیا تھا وہ ان پردیسی کو ایسے ناوقت سواری کر کے ہوٹل لے ہو گیا اور وہاں ہر طرح کا پورا بندوبست ان کے آرام کا کیا اور جب اپنا بہت سا وقت عزیز صرف کرنے کے بعد ان سے رخصت ہونے لگا تو قبل اس کے کہ یہ کچھ کہہ سکیں بولا کہ اگر آپ شکریہ ادا کرنا چاہیں گے تو مجھے تکلیف ہوگی! یہ دنگ رہ گئے کہ اس دنیا میں اب بھی اس ظرف کے لوگ پڑے ہوئے ہیں! ـــــــ

نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ محض ایسی ہدایت نہیں جو کتابوں ہی کی

زینت ہوئی ہے۔ برتنے پر آجائے تو ہم آپ سب ہی اُسے برت سکتے اور اپنے سرمایہ سکون و راحت میں بے انتہا اضافہ کر سکتے ہیں۔

———.·✲·.———

(۲۷) مذہب اور قومیت[1]

لڑکوں اور نوجوانوں کے لئے تو خیر سنی سُنائی ہے لیکن آج کے بڑے بوڑھوں کے لئے ۱۹۱۹ء کی تحریک خلافت و ترک موالات آنکھوں دیکھی ہے۔ وہ طوفان، وہ ہیجان، وہ بحران کہ آج بھلانا چاہئے بھی تو دماغ تعمیل سے انکار کردے۔ اک آگ تھی کہ پشاور سے راس کماری تک اور ڈھاکہ سے کراچی تک لگی ہوئی اور پھر وقتی اُبال ہفتہ دو ہفتہ کا نہیں۔ زور و شور سمجھئے کوئی تین برس تو قائم رہا۔ اب ذرا حافظہ پر زور ڈال کے یہ بھی یاد کر لیجئے کہ تحریک کی باگ ڈور تھی کن ہاتھوں میں ہے؟ —— گاندھی جی اور علی برادران کو تو چھوڑیئے کہ ان کے نام تو یاد کی کوشش کئے بغیر ہی نوک زباں ہیں۔ باقی اور بڑے اور چھوٹے لیڈر۔ ایک طرف موتی لال، سی آر داس، راج گوپال آچاریہ، وٹھل بھائی پٹیل، راجندر پرشاد، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، اور سیاسی اکھاڑے کے اور نامی پہلوان۔ اور دوسری طرف شیخ الہند محمود الحسن، مولانا عبدالباری فرنگی محلی،

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ جولائی ۱۹۵۱ء کی شام کو۔ وقت: ۱۵ منٹ

مولانا ابوالکلام، شری شنکر آچاریہ، اور مذہبی حلقوں کی دوسری جانی پہچانی ہوئی ہستیاں۔ تو تحریک ایک طرح پر مذہبی تھی اور ایک پہلو سے سیاسی۔ زیادہ صحیح طور پر یوں کہیے کہ تحریک ایک مجموعہ تھی مذہب اور سیاست کا ایک کامل نمونہ یا آئیڈیل مذہب اور قومیت کے درمیان توازن کا اور ان لوگوں کا ایک مکمل جواب جو ذہن میں یہ خیال جمائے بیٹھے ہیں کہ آدمی یا تو مذہب کا ہو کر رہے اور یا قومیت کا! اس تحریک کے جو نتیجے فوری اور براہ راست نکلے اور جو بالواسطہ اور دور رس پیدا ہوئے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔

انسان اُلجھنے اور جھگڑنے پر آئے تو ہیرے میں بھی کیڑے نکال سکتا ہے اور کوئی سینہ زوری پر رکھ لے تو دو اور دو کو چار کی جگہ پانچ بھی ثابت کر دکھانے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ لیکن ہے یہ کہ مذہبیت اور وطنیت کے درمیان کوئی شئے آپس میں ٹکرانے کی اور ایک دوسرے سے اُلجھنے اُلجھانے کی ہے ہی نہیں۔ قوم کی دوستی ہوئی یا ملک و وطن کی محبت یہ تو ایک جذبہ ہے فطری اور طبعی۔ گورے کالے، بڑے چھوٹے، صاحب اور "نیٹو" امیر غریب، بوڑھے بچے۔ سب کے دلوں میں موجزن۔ بلکہ انسان تو انسان ہے۔ سمجھ دار حیوان تک اس سے خالی نہیں۔ کتے کو دیکھئے تو اپنی گلی کا دیوانہ، بلّی پر نظر کیجیے تو اپنے ٹھکانے کی حریص، گھوڑے پر نگاہ دوڑائیے تو اپنے تھان کا عاشق۔ تو یہ تو ہوئی وطن کے ساتھ جنم بھومی کے ساتھ، مرزبوم کے ساتھ طبعی، فطری، جبلّی محبت۔ اب رہا مذہب تو وہ اس سے بالکل الگ نام ہے ایک آئیڈیل کا جس کے ماتحت زندگی کا ایک ایک قدم اُٹھایا جائے نام ہے ایک راستہ کا جو مخلوق کو خالق سے ملا دے اور خاکی کو جنت تک پہنچا دے۔ وہ راستہ جس پر چل کر زندگی کا ایک ایک نشیب و فراز، ایک ایک پیچ و خم، امن اور سلامتی کے ساتھ، دل کے سکھ اور چین کے ساتھ

بسر ہو اور یہ دل کا چین ابدی ہو۔ یہاں کی زندگی ختم ہو جائے اور یہ نہ ختم ہو۔ یہ تو دوسری زندگی میں بھی ساتھ دیئے جائے بلکہ یہاں سے وہاں ہزار ہا درجہ بڑھ جائے۔

تو جب دونوں کے یہ حدود معلوم ہو گئے تو اب جھگڑے کا امکان کیا رہا۔ زندگی کا مرتب و باقاعدہ نظامِ عمل جس کا نام مذہب ہے اور اس فطری، جبلی علاقہ محبت کے درمیان جس کا نام جذبہ وطنیت ہے تصادم کی ٹکراؤ کی صورت ہی کیا ہے۔ بجز اس کے کہ نظر کی کجی یا سرشت کی بدی خود ہی حدود ناشناسی سے کام لینے لگے یا غلو پسندی میں مبتلا ہو جائے۔ اور قوم پروری یا وطن دوستی کو مذہب کے مقابلہ میں اور اس کی سطح پر لے آئے۔ اور گویا بقول شخصے

قصور ڈھونڈھ کے پیدا کئے جفا کے لئے!

تو یہ قصور تو اپنی طبیعت کا، اور فتور اپنے نفس کا ہوا نہ کہ مذہب کے محترم و مقدس اصول کا، یا وطن دوستی کے پاک و پاکیزہ جذبات کا!

اب مذہب بھی جو ایسے ہیں جن میں بڑا اور مرکزی درجہ وطن کا ہے انھیں تو خیر جانے ہی دیجئے۔ اسلام کو لیجئے۔ جو مقام و مکان کی قید سے کہنا چاہیے بالکل آزاد ہی ہے۔ اس تک کا یہ حال ہے کہ پیمبر برحق یوسف علیہ السلام کو اپنے وطن سے جو محبت تھی اور بعض دوسرے پیمبروں کو اپنا وطن چھوڑنا جیسا شاق گذرا ہے۔ اس کی روداد سے قرآن کی بین السطور لبریز ہے۔ اور یہ حال تو جو چاہے سیرت نبوی کی کتابوں میں پڑھ سکتا ہے کہ ہمارے رسول پاک صلعم نے جب اپنے پروردگار کے حکم سے اپنے وطن شہر مکہ کو چھوڑا ہے تو بار بار شہر کی طرف حسرت و محبت کی نظروں سے دیکھتے جاتے تھے اور اس کے چھوٹنے کا رنج نہ صرف دل سے محسوس فرما رہے تھے بلکہ زبان سے بھی برملا اس کا اظہار کر رہے

تھے اور یہی کیفیت بڑے بڑے پایہ کے صحابیوں یعنی رسول کے معزز و مقرب رفیقوں کی ہوئی ہے۔ مسلمان کے عقیدہ میں رسول کا ہر عمل ایک معیاری عمل ہے اور رسول کا مزاج ہر اعتبار سے توازن و اعتدال کا مکمل نمونہ۔ تو وطن کی محبت جب آپ کے قلب مبارک میں رچی ہوئی اور آپ کے خالص و مخلص رفیقوں کی طبیعت میں بسی ہوئی تھی تو اب اس میں شک کس کو رہ سکتا ہے کہ وطن کی محبت ایک نعمت ہے قابل قدر۔ اور جس نے اپنے شہر اور ملک کے ساتھ دوستی کا حق ادا کیا۔ اس کو رسول اور ان کے صحابیوں کے نقش قدم پر چلنے کی دولت خواہ مخواہ ہاتھ آگئی۔

پھر ہجرت کا جو اعلیٰ درجہ و اجر ہمارے ہاں رکھا گیا ہے وہ خود اس کی دلیل ہے کہ وطن کا چھوڑنا ہر طبع سلیم کو کس قدر گراں گزرتا ہے اور اس کا پاس کس حد تک ہماری شریعت نے رکھا ہے۔ ہجرت کرنے والوں کا درجہ بس شہیدوں ہی کے لگ بھگ ہے —— اور آگے چلئے۔ شہادت مومن کے لئے موت کی بلند سے بلند شکل کا نام ہے۔ اس کی ایک قسم (وہ قسم ہلکی ہی سہی) ہمارے ہاں یہ بھی بتائی گئی ہے کہ کوئی شخص اپنی مِلک و جائداد کی حفاظت میں مارا جائے اور کون سی مِلک و جائداد خود وطن سے بڑھ کر حق رکھنے والی ہو سکتی ہے؟ —— اس سے بھی آگے بڑھیے۔ خاص قرآن مجید میں جہاں ذکر مکّہ کے مظلوم مہاجروں اور شہیدوں کا ہے وہاں فضیلت کے موقع پر یہ مضمون بھی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے نکالے گئے، اپنے وطن سے بے وطن کر دیے گئے۔

غرض وطن سے انس و الفت رکھنا ایسا ہی لازمۂ انسانیت و تقاضائے شرافت ہے جیسا بھائی بہن سے محبت کرنا عزیزوں پڑوسیوں کا دل ہاتھ میں

لینا، محلہ والوں سے میل ملاپ کا رشتہ جوڑے رکھنا۔ مذہب جب ہر قدرتی جذبہ کا احترام کرتا ہے تو اس کا کیوں نہ کرتا۔ اس کی فضیلتیں بیان کرکے حب وطن رکھنے والوں کے دل بڑھاتا ہے۔ پڑوسیوں کی خدمت کرنا محلہ والوں کے دکھ سکھ میں شریک رہنا، فلاح عام کے کاموں میں بستی بھر کا ساتھ دینا وقت پڑے پر دشمن کے مقابلہ میں ساری بستی والوں کی طرف سے سینہ سپر بن جانا، یہ سب مختلف منزلیں وطن دوستی اور قوم پروری کی نہیں تو اور کیا ہیں۔ اور ان میں سے ہر منزل اپنے اپنے مقام پر ایک اجر رکھتی ہے۔

کسی فرد کا فلاں ملک یا فلاں قوم میں پیدا ہونا ظاہر ہے کہ اس کے ارادہ واختیار کی چیز نہیں، اس کے لئے تمام تر ایک امر اتفاقی وغیر ارادی ہے۔ مذہب اس کے ٹھیک برعکس ایک عقلی وارادی ادارہ ہے۔ اسے انسان اپنے اختیار سے کام لے کر پسند کرتا ہے۔ چاہے تو جس مذہب کے اندر پیدا ہوا ہے اس پر قائم رہے اور چاہے تو اسے چھوڑ دے۔ مذہب سو فی صدی ایک مقصدی چیز ہے اور اس کی ایک اہم اور بنیادی تعلیم یہ ہے کہ عقیدہ اور کردار کی جن چیزوں پر بھی فلاح ونجات کا دارومدار ہے وہ سب کی سب اختیاری ہیں۔ یہ اختیاری احکام اور فرائض کہیں بھی انسان کی جبلی تقاضوں اور فطری مطالبوں سے آکر نہیں ٹکراتے۔ مذہب کے قانون کی یہ کوئی سی بھی دفعہ نہیں کہ پیاس کے وقت پانی نہ پیا جائے بھوک کے وقت کھانا نہ کھایا جائے اور نیند کے وقت سویا نہ جائے۔ سچا مذہب تو ان فطری جذبات کی اور قدر کرتا ہے۔ ان کی پرورش میں لگا رہتا ہے اور ان کی پاس داری کو اپنے نقشہ ہدایات میں ایک ممتاز ومعزز جگہ دیتا ہے۔

مذہب سے نیشنلزم کے ٹکراؤ کی صورت ایک ہے وہ یہ کہ نیشنلزم بے لگام

کا گھوڑا، بے نکیل کا اونٹ، بے ڈرائیور کا متحرک انجن بن جائے اور عقل اعظم کے بجائے اپنے کو زندگی کے ہر شعبہ میں حاکم مطلق بنا لینا چاہے۔ اس جارحانہ (AGGRESSIVE) منزل پر آ کر وہ ہر دوسری نیشنلزم سے ٹکرائے گی اور مذہب سے بھی بے بات کی بات نکال کر دست و گریبان ہو گی اور اس صورت میں، وہ دنیا کے امن عامہ کے حق میں بھی ایک مہیب خطرہ بن جائے گی۔ مذہب ایسے موقع پر آ کر اپنی بالادستی کو یاد دلائے گا، دنیا کو امن و سلامتی کا سبق دے گا۔ دشمنوں تک کے حق میں عدل کی تعلیم دے گا اور انسانیت کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو پھر سے جوڑنے کی کوشش کرے گا۔ ——— برطانیہ کے قدیم فلسفی بیکن کا مقولہ مشہور ہے کہ علم و حکمت میں شد بد انسانی دماغ کو دہریت و الحاد کی طرف لے جاتی ہے لیکن علم و حکمت میں کامل دستگاہ پھر ایمان و اقرار کی طرف واپس لے آتی ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ غلط و فاسد قسم کی وطنیت مذہب سے آ کر ٹکرا لیتی رہتی ہے۔ لیکن صحیح و صالح قسم کی وطنیت تو خود ایک عبادت اور جزو مذہب ہے جس کا ایک واضح نمونہ ہندوستان ابھی تحریک خلافت و ترک موالات کے زمانہ میں دیکھ چکا ہے۔

---

(۲۸) ہمہ گیر اخوت[1]

اگر یہ سچ ہے کہ سارے انسان، چاہے گورے ہوں یا کالے، لال ہوں یا پیلے، امیر ہوں یا غریب، مشرق کے ہوں یا مغرب کے، چین کے ہوں یا فلسطین کے، بولی انگریزوں کی بولنے والے ہوں یا برما والوں کی، اولاد ایک آدمؑ اور ایک حوّاؑ کی ہیں، تو یہ بات صاف اور نتیجہ ظاہر ہے کہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں، ایک ہی دریا کی لہریں ہیں، ایک ہی پھول کی پتیاں ہیں اور یہ عقیدہ روئے زمین کے مسلمانوں کا عیسائیوں کا یہودیوں کا تو خیر ہے ہی۔ دوسرے بھی جتنے مذہب ہیں سب نے کسی نہ کسی طرح اسی کو مانا ہے۔ لفظوں کے الٹ پلٹ اور اصطلاحوں کے ہیر پھیر سے کہیں حقیقتیں تھوڑی ہی بدل جاتی ہیں۔

اور جب ماں باپ ایک ٹھہرے، چاہے وہ ایک پشت اوپر ہو، یا سو دو سو، ہزار پشتیں اوپر، تو بھائی بننے میں کیا کوئی کسر باقی رہ گئی؟ رہا طبیعت کا اختلاف، مزاج و مذاق کا اختلاف، صورت و شکل کا اختلاف، عقیدوں اور خیالات

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ ۳۱ ر اگست ۱۹۵۱ء کی شام کو وقت: ۱۴ منٹ۔

کا اختلاف، تو وہ کیا سگے بھائیوں میں نہیں ہوتا، اور پورے زور کے ساتھ نہیں ہوتا؟ لیکن اس کے باوجود بھی بھائی بھائی ہی رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے حق میں سنگدل قصائی نہیں بن جاتے۔ تو پھر قوموں اور ملکوں کا اختلاف برادرانہ یکجہتی کی راہ میں اس سے زیادہ کیوں حائل ہو؟ یہ اختلاف چاہے زبان اور بولی کا ہو یا رنگ و روپ کا یہاں تک کہ مذہب و اختلاف کا اسے آخر اس کے درجہ سے زیادہ کیوں اہمیت دیجئے اور اسے انسان کی مشترک انسانیت یا آدم زادوں کی عام آدمیت پر کیوں غالب آنے دیجئے؟

یہ تو ہوئی مسئلہ پر گفتگو ذرا مذہبی بنیاد پر، اب محض عقلی حیثیت سے سوچئے ساری دنیا میں فطرت کی طرف سے جو نظم و نظام اور ضابطہ و انتظام قائم ہے وہ ہمیں کس نتیجہ کی طرف لے جاتا ہے؟ ہر شئے دوسرے کی محتاج ہر وجود قدم قدم پر دوسرے کی مدد کا حاجت مند، بڑے چھوٹے کی کوئی خصوصیت نہیں۔ سردار کے بغیر اگر فوج بے سری رہ جاتی ہے تو خود افسر بھی بغیر سپاہیوں کے ایک بلا بارات کا دولہا۔ رعایا اگر چتر شاہی کے سایہ کے بغیر منتشر و آوارہ، بے والی و بے وارث تو بادشاہ سلامت بھی بغیر رعایا کے لفظ بے معنی و سایہ بلا جسم، وہم بغیر حقیقت، چمار اور موچی، مہتر اور دھوبی، گھسیارے اور نائی اگر یہ اپنے اپنے کام چھوڑ دیں تو پھر دیکھئے وکیل صاحب اور ڈاکٹر صاحب، ڈپٹی صاحب اور کلکٹر صاحب، نواب صاحب اور راجہ صاحب کی کیا گت بن کر رہتی ہے۔ ان کے کام ان سے اٹکے ہوئے ان کی ضرورتوں کی زنجیر ان کے دامن سے بندھی ہوئی نہ کوئی کسی سے بے نیاز ہر فرد دوسرے فرد کی طرف ہمہ احتیاج۔ تو اب سوا اس کے چارہ ہی کیا رہ جاتا ہے کہ عمل میں ایک دوسرے کو بھائی بنائے۔ دل سے بھی بھائی سمجھے اور زبان سے بھی بھائی کہہ کر پکارے۔

انسان کی جو ساخت و فطرت، جو ترکیب اور بناوٹ ہے ذرا اس پر دھیان دیجئے کہ خود اس کی پکار یا دعوت کیا ہے۔ بھوک جیسی ایک انسان کو لگتی ہے ویسی ہی دوسرے کو، نیند جیسے مشرقی کو آتی ہے ویسے ہی مغربی کو، محنت سے تھک کر چور اگر جسم ایک مسلمان کا ہوتا ہے تو ایک ہندو کا بھی، غصہ جس طرح ایک عیسائی کو آتا ہے اسی طرح ایک یہودی کو بھی۔ مال و دولت۔ صحت و طاقت بیوی بچوں سے خوش جس طرح ایک فرنگی ہوتا ہے اسی طرح ایک آسٹریلوی بھی بیمار جس طرح ایک ملک کا باشندہ پڑتا ہے دوسرے ملک کا بھی پیدائش، حمل، وضع حمل کے جو قانون گورے کے لئے ہیں، کالے کے لئے بھی۔ موت سے اپنے وقت پر جس طرح یہاں والے فنا ہوتے ہیں اسی طرح وہاں والے بھی۔ غرض بشری جذبات طبعی کیفیات، زندگی کے چڑھاؤ اتار، شرکت کی یکسانیت جبلتوں کی نوعیت کے اعتبار سے سارے انسان ایک ہی سطح پر ہیں اور یہ گویا فطرت کی طرف سے پکار ہے کہ سب انسان بھائی ہی بھائی ہیں۔

بات اتنی صاف اور موٹی ہے کہ اب اس کو زیادہ پھیلایا کیا جائے۔ سوا اس کے کہ اب یہ دیکھ لیا جائے کہ اس راہ میں حائل کون کون سے پتھر ہوتے ہیں اور ہو سکے تو انھیں دور کر دیا جائے۔

ہمہ گیر اخوت کا سب سے بڑا دشمن نیشنلزم یا قومیت کا چلا ہوا تصور ہے۔ وطن دوستی یا قوم پروری بجائے خود کوئی بُری چیز نہیں۔ بلکہ انسان کے لئے تو عین ایک جذبۂ فطری ہے۔ جیسے گھر بار کی محبت ویسے ملک و قوم کی محبت اور وہ انسان ہی کیا جس کا دل اس جذبۂ طبعی سے خالی ہو۔ لیکن نیشنلزم کا جو عام اور چلا ہوا تخئیل یہ ہے کہ اپنی قوم دوسری قوموں سے برتر و افضل اور اپنا ملک دوسروں کا سرتاج ہے اور ان پر ایک افرانہ فوقیت

اور بالادستی رکھتا ہے۔ بس یہی پندار تفوق جس طرح اپنے میں پیدا ہوتا ہے دوسروں میں بھی اپنی اپنی قوم اور اپنے اپنے ملک سے متعلق پیدا ہو جاتا ہے اور یہیں سے ابتدا باہمی تصادم کی ہوتی ہے۔ ایک نیشنلزم دوسری نیشنلزم سے ٹکراتی ہے اور ایک قوم کی انانیت دوسری قوم کے سر ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ جو دلیلیں ایک قوم اپنی افضلیت و برتری کی رکھتی ہے وہی دوسری قوم بھی پیش کر دیتی ہے۔ اور یہیں سے ہاتھا پائی اور سر پھٹول کی ٹھہر جاتی ہے۔ آغاز اخبار والوں کی للکار اور سیاسی رہبروں کی رجز خوانیوں سے ہوتا ہے اور انجام گولہ باریوں پر، ٹینک نوازیوں پر، دمدموں اور دھوؤں کی کثرت و قوت پر اور ایٹم بم و ہائیڈروجن بم کی قیامت خیزیوں پر! ____ سو بنیاد اس غسل خونین اور برادر کشی کی اسی مبالغہ آمیز قوم پرستی پر ٹھہرتی ہے۔ جہاں پروا نہ حق و انصاف کی رہ جاتی ہے اور نہ فکر صداقت و دیانت کی اور MY COUNTRY RIGHT OR WRONG کا جنون سر پر سوار ہو جاتی ہے۔

مذہب نے اس کا علاج یہ بتلایا ہے کہ نظر خلق سے زیادہ خالق پر اور کثرت سے زیادہ وحدت پر رہے اور اصل کو بہر حال و بہر صورت شاخوں پر مقدم رکھا جائے ____ تاریخ اور تجربہ دونوں کی یہ شہادت ہے کہ مذہب کا بتایا ہوا یہ نسخہ تیر بہدف اور یہی علاج اب تک اکسیر ثابت ہوا ہے۔

اور جو نتیجہ اس قومی تفوق اور غالبانہ نیشنلزم کا نکلتا ہے بالکل وہی زبان کے تفوق، نسل کے تفوق، رنگ کے تفوق سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ آج بھی جنوبی امریکہ سے لے کر ایشیا تک کے سارے ملکی جھگڑوں کا

جائزہ لے ڈالئے۔ سب کی تہ میں آخر کار یہی جذبہ اپنے اجتماعی اَنا یا SELF کے تفوق کا کارفرما نظر آئے گا ——— "جاہلیت" کو بے سوچے سمجھے آج ہم سب برا کہنے کو تیار رہتے ہیں لیکن غور کیجئے آج ہم بھی ٹھیک اسی سطح پر ہیں یا نہیں۔ وہاں بھی تو لڑائی کے لئے بہانے ڈھونڈے اور الزامات تراشے جاتے تھے۔ اور ایک قبیلہ دوسرے سے اتنی سی بات پر بھڑ جاتا اور اس کی جان کو آجاتا تھا کہ اس نے چشمہ پر اپنے مویشیوں کو اپنے گلوں کو پانی پہلے کیوں پلالیا۔ اس پر ہنسئے مسکرائیے نہیں آج بھی جو بڑی بڑی مہذب قومیں ایک دوسرے پر چڑھائی کرنے کے لئے اپنی ذہانت طباعی، باریک بینی کے جو جوہر دکھاتی رہتی ہیں وہ کیا اگلوں کی حیلہ تراشیوں سے کچھ کم ہے!

مذہب کی زبان میں احساس تفوق کی ان ساری صورتوں کے لئے لفظ کبر و پندار کا ہے اور کبر و پندار کے بعد دوسرا محرک اس خون خرابے اور برادر کشی کا انسان کے اندر جذبہ حرص و ہوس ہے اور اس کے تحت میں مالی، جاہی، شہوانی ہر قسم کی ہوسناکی آگئی۔ وہی جس کے لئے ایک پرانا جامع مقولہ "زر، زن، زمین" کا چلا آرہا ہے۔ ہندوستان کی جنگ مہابھارت اور یونان کی جنگ ٹرائے سے لے کر بیسویں صدی تک کی تاریخ محاربات پر نظر کر جائیے۔ خدا جانے کتنی جنگوں کی بنیاد آخری لفاظیوں کی تحلیل کے بعد اسی جذبہ ہوس کا نتیجہ دکھائی دے گی۔ "پڑوس کا کمزور ملک فلاں فلاں سامان معیشت میں بڑھا چڑھا ہوا ہے کیوں نہ اسے زیر کر کے سامان کو اپنے قبضہ میں لایا جائے"۔ دنیائے حرب و ضرب کا ہر الٹی میٹم (پیام جنگ) کے بین السطور کو غور سے پڑھیے عجب نہیں کہ

بخطِ غبار و حروفِ خفی کچھ اسی قسم کی عبارت نظر پڑے۔ یہ افراطِ ہوس ایسی چیز ہے جس کے ڈانڈے حسد سے بھی ملے ہوئے ہیں۔ اور اکثر ان دونوں کا وجود ساتھ ہی پایا جاتا ہے۔ ایک دوسرے سے مدغم، ایک دوسرے میں ضم۔ مذہب نے یہاں بھی صحیح و حاذقانہ تشخیص سے کام لے کر اس دہرے اور مہلک مرض کا علاج کل دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ صبر و قناعت اور تاریخ، تجربہ، مشاہدہ سب کی مہرِ تصدیق اس نسخہ کی بھی زود اثری اور سو فی صدی کامیابی پر لگی ہوئی ہے۔ ہوس و حسد کی آگ جب بھی اور جہاں کہیں بھی بجھی ہے اسی صبر و قناعت کے پانی سے ــــــ مبارک ہیں وہ قومیں جنھیں اس نسخہ کے استعمال کی توفیق ماضی میں ہو چکی ہے یا حال میں ہو رہی ہے۔

غرض یہ کہ برادر نوازی اور عالمگیر صلح و سازگاری تو فرد کی جسمانی صحت کی طرح ہر قوم کے لئے بھی ایک طبعی، فطری چیز ہے۔ ہر قوم کا قدرتی رجحان اور فطری تقاضا یہی ہونا چاہئے اور یہی رہتا بھی ہے۔ لیکن ہر انسان جس طرح بد پرہیزیاں کر کے اپنے کو بیمار ڈالتا اور اپنے جسم کو ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے اسی طرح قومیں بھی اپنے اصل مزاج اور صحیح و صالح فطرت کو مختلف اخلاقی بے احتیاطیوں اور بد پرہیزیوں، مثلاً کبر و انانیت، حرص و ہوس، رشک و حسد سے بگاڑ لیتی اور اپنے کو خواہ مخواہ جنگ و جدل، فتنہ و فساد پر آمادہ کر لیتی ہیں یہ صورتِ حال محض ان کی مریضانہ ذہنیت کا نتیجہ ہوتی ہے اور انجام اکثر یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کی تباہی و بربادی کی دھن میں ان کے ساتھ اپنی بھی تباہی و بربادی کا سامان کر لیتی ہیں۔ مقدمہ بازوں کے طبقہ میں ایک مثل مشہور ہے کہ جو جیتا وہ ہارا جو ہارا

وہ مرا۔ اور یہ مثل مقدمہ بازوں سے کہیں بڑھ کر صادق جنگ بازوں پر آتی ہے۔ جو قومیں شکست کھا جاتی ہیں ان کے ذکر سے تو توبہ ہی بھلی باقی جو قومیں فتح کے شادیانہ بجاتی اور کامیابی کے ترانے گاتی ہوئی آتی ہیں خود ان بیچاریوں کا کیا حشر ہوتا ہے؟ برطانیہ کو دیکھئے جنگ عظیم کے اکھاڑے میں جرمنی کو پچھاڑ کر نکلا لیکن پٹھا جب باہر آیا تو دیکھنے والے دیکھتے گیا ہیں کہ جسم چور چور، اور جوڑ جوڑ خود ہی مرہم پٹی کا محتاج! ——— اسی کو کہتے ہیں ؎

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو

قلب حق آگاہ اور دیدہ عبرت نگاہ، عقل عافیت کوش اور گوش نصیحت نیوش کا تقاضا یہ ہے کہ قومیں اپنے کو پہچانیں، اپنی شخصیت کے حدود و قیود کو جانیں خود شناسی کو کام میں لائیں۔ فطرت کی طرف سے ڈھیل اور مہلت پہ نہ جائیں، عبدیت سے بغاوت نہ کریں۔ الزامات اپنے ہمسایوں پر نہ گڑھیں۔ دوسروں کے حقوق اپنے سے سمجھیں۔ انانیت کے نشہ میں سرشار ہو کر ان سے نہ الجھیں۔ خودی و خود پرستی کو مٹائیں عبدیت و خدا ترسی کو بڑھائیں۔ دنیا کو جنت کا نمونہ نہ بنائیں۔ شر و فساد کے دوزخ سے اپنے کو اور سب کو بچائیں ——— یہی ہے زندگی کی راہ اور بندگی کی شاہراہ!

———— ⁂ ————

(۲۹) یوم عید[1]

اللہ اکبر اللہ اکبر۔ لا الٰہ الا اللہ۔ و اللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد۔ یہ آج ہے کیا، صبح ہی صبح تکبیر کی صدائیں دھیمے سروں میں۔ میٹھے بولوں میں ہر طرف سے کانوں میں چلی آرہی ہیں اور مسلمان ہیں کہ ٹولیوں کی ٹولیاں بنائے، نہلائے دھوئے، بنے سنورے عطر لگائے، بوڑھے اور جوان، بچے اور بچیاں، امیر و غریب سب اِدھر سے اُدھر رواں ہیں؟ —— ہے یہ کہ آج عید ہے: سال کے دو بڑے اسلامی تہواروں میں سے پہلا تہوار، اور مسلمان اسی کا جشن منانے نکلا ہے۔ لیکن یہ کیسا جشن اور تہوار ہے، دنیا جہان کے جشنوں اور میلوں سے نرالا کہ ناچ نہ مجرا، راگ نہ باجا، بس زبانوں پر حمد کے زمزمے اور ہونٹوں پر توحید کے نغمے! جی ہاں، اللہ کے ان بندوں کی شریعت کے مزاج ہی میں بانکپن ہی کچھ ایسا ہے!

دارد آں آفت جاں حسن و جمال عجبے
چشم مست عجبے وابرو و خال عجبے

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے - ۲۵ر جون ۱۹۵۲ء کی شام کو۔ وقت: ۱۰ منٹ۔

ابھی کل شام تک تو رمضان ہی تھا۔ ہر گیارہ مہینہ کے بعد ایک پورا مہینہ بھوک اور پیاس کا، صبر و ضبط کا، اب اس میں چاہے مئی ہو یا جون، نور کے تڑکے سے لے کر شام کے جھٹ پٹے تک ۱۵، ۱۵ گھنٹے تک پیاس کو دبائے رہیے، چاہے ہونٹوں پر پپڑیاں اور زبان میں کانٹے پڑ جائیں پانی کا ایک قطرہ بھی حلق کے اندر نہ جانے دیجئے۔ اور پھر رات جب آجائے تو بجائے خواب غفلت میں پڑ جانے کے نمازیں اور زیادہ پڑھیے۔ تو ابھی کل تک تو مہینہ ہی عبادت و ریاضت کا تھا، رات کو مسجدیں تراویح سے گونجتی رہتی تھیں اور آج صبح جو ہوئی تو اس ماہ مبارک کے حسن خاتمہ کی خوشی میں سڑکیں اور گلیاں تک کلمہ کی صداؤں سے گونجنے لگیں؟ عبادت تو خیر

عبادت ہوتی ہی یہاں جشن مسرت بھی سراسر عبادت

چشم مستے عجبے زلف دراز عجبے

اور ان تکبیروں میں جاہ و جلال کی گرمی نہیں یکسر شان جمال کی نرمی! از زبان تو زیر عبدیت کے زمزمے اور ہونٹوں پر عبودیت کے نغمے، اس سج دھج سے مسلمان چلا ہے نماز پڑھنے۔ اس حال میں کہ کچھ نہ کچھ تحفہ اپنے مال میں سے بھی دوسروں کی نذر کر چکا ہے۔ اور یہ دیکھ چکا ہے کہ اس کے علم میں اس کی بساط بھر اڑوس پڑوس بلکہ محلہ میں کوئی نادار آج بھوکا نہ رہنے پائے گا۔ بستی کے باہر سب مسلمان ایک جگہ نماز پڑھیں گے۔ بڑے اور چھوٹے، خادم اور مخدوم۔ زردار اور نادار۔ محمود و ایاز۔ راجا اور پرجا، سب صف بر صف کھڑے ہوں گے۔ اور ایک اللہ اکبر کی آواز پر ایک ساتھ اٹھیں گے ایک ساتھ بیٹھیں گے۔ ایک ساتھ جھکیں گے ایک ساتھ کھڑے ہوں گے، ایک ساتھ ہاتھ باندھیں گے، ایک ساتھ سلام

پھیریں ـــــــــ دو رکعت نماز کے بعد امام کی زبان سے خطبہ سُنیں گے۔ کچھ دعائیں کچھ احکام۔ کچھ کام کی باتیں۔ کچھ روزہ داروں کے لئے بشارتیں۔ اس کے بعد آپس میں گلے ملیں گے اور خوش خوش گھر واپس ہوں گے اور شیر خرما اور میٹھی سوئیاں پئیں گے عزیزوں دوستوں اور گھر والوں کو بلائیں گے اور اسی میں شام ہو جائے گی۔

عیدگاہ کے اندر روحانی نعمتوں کا جو خزانہ لٹ رہا ہے اسے چھوڑ کر ذرا باہر آیئے یہ باہر کی دلآویزیاں اندر کی دلکشی سے کچھ کم نہیں ہوتیں یہ قول تھے۔ ع

کم نہیں کچھ دل کشی میں ناز سے رنگ نیاز

دکانیں ہر طرح کی لگی ہوئی۔ کہنا چاہیے کہ پورا بازار سجا ہوا اور کھانے پینے کی تو ہمہ نعمت موسم وفصل کی رعایت سے موجود۔ ادھر چائے کے گرما گرم سماور ہیں کہ کس گرمجوشی سے آپ کے استقبال کو بڑھ رہے ہیں۔ ادھر برف کی قفلیاں ہیں۔ کھیر کی ہانڈیاں ہیں کہ دل و دماغ تک اپنی ٹھنڈک پہنچائے دیتی ہیں۔ ادھر حلوائی صاحب تھال پر تھال وہ لذیذ وخوش رنگ مٹھائیوں کے جمائے ہوئے ہیں کہ ایک بار نظر ان پر پڑ جائے تو شاید وہیں جم کر رہ جائے۔ اور بے شیر و شکر بنے واپس نہ آئے۔ ادھر کبابیوں کے ہاں سے خوشبوئیں وہ بلا کی آ رہی ہیں اور سرخ سرخ سیخیں وہ منظر دکھلا رہی ہیں کہ صبر کرنے والوں کے دل خود کباب ہوئے جا رہے ہیں۔ پھر کھلونے والے اور پھل والے ایک سے بڑھ کر ایک بچوں اور بڑوں کے دل لبھانے والے ـــــــــ دین دنیا یکساتھ۔ جنت کے سودے کے ساتھ ساتھ نفع عاجل کا بھی دم چھلا۔

رمضان کی برکتوں کا کیا کہنا اور پھر آخر عشرہ کی راتوں کی قدر و قیمت

کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ لیکن انھیں رحمتوں کی وسعت بیکراں ملاحظہ ہو کہ عید کی رات کا شمار، اجر و برکت کے لحاظ سے انھیں رمضان کی راتوں میں ہے جو اس رات کو جاگا۔ اس نے گویا اخیر رمضان ہی کی ایک اور رات کو پایا۔ اور پھر یہ ارشاد بھی ایک سچے کی زبان سے ہو چکا ہے کہ عید کو تڑکے ہی سے فرشتے یہ صدا دینے لگتے ہیں کہ لوگو نماز کو چلو، اور عبادت کو آمادہ ہو۔ فرشتوں کی آواز بھلا ہمارے یہ مادی کان کیا سُن سکتے ہیں۔ لیکن دل کے کان ہوں نہ ہوں اس آواز غیبی سے کچھ ربط ضرور رکھتے ہیں۔ جب ہی تو مشاہدہ ہے کہ نمازیوں کے پرے کے پرے عیدگاہ اور مسجدوں کو روانہ ہو رہے ہیں۔ جنھیں سال بھر بھی دو ٹکریں زمین پر لگانا نصیب نہیں ہوتیں۔ وہ آج خوشی خوشی دوگانہ پڑھنے آ رہے ہیں اور بڑے بڑے نمبری بے غسلے آج بغیر کسی کے ٹھیلے اور ڈھکیلے خود ہی نہانے دھونے میں لگے ہوئے ہیں۔

عید کا صدقہ کس مقدار میں ہو۔ یہ تفصیل کسی فقہ کی کتاب میں دیکھ لیجئے یا کسی پڑھے لکھے سے پوچھ لیجئے۔ بہر حال تاکید اس کی آئی ہے کہ اسے نماز سے قبل ہی ادا کر دیا جائے۔ نہ ادا ہو تو خود رمضان کے روزوں کی مقبولیت ہی کے ادھڑ میں پڑے رہ جانے کا خطرہ ہے —— خالق تنہا اپنی عبادت سے راضی ہی کب ہوتا ہے، جب تک مخلوق کے بھی حق ادا نہ کر لئے جائیں!

جن لوگوں کو رمضان کے روزے رکھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے خصوصاً چلچلاتی ہوئی دھوپ کے موسم میں اور پہاڑ سے لمبے دن میں۔ ان کے دلوں سے کوئی قدر روزانہ افطار کی پوچھے۔ کس بے انداز مسرت و راحت کا وقت شام کا ہوتا ہے اور بندہ مومن مہینے کے تیسوں دن اس

مسرت سے شاد کام ہوتا رہتا ہے۔ عید کا دن کہنا چاہئے کہ سارے مہینہ کی مسرتوں کا جامع اور لب لباب ہوتا ہے جو بد نصیب روزہ کی سعادت ولذت سے محروم رہے وہ آج کی مسرت بے انداز کا اندازہ ہی نہیں کرسکتے ـــــ اردو محاورہ میں روز عید، یوم جشن کے مرادف ہے۔ جس طرح شب برات شب جشن کے۔ جب عیش وعشرت کی مثال دینا ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ دن عید ہے اور رات شب برات۔ یہ تو خیر نری شاعری ہے۔ شریعت نے ذمہ داری اور مسئولیت کا ضمیمہ بشر کے چھوٹے بڑے ہر عمل اختیاری کے ساتھ لگا رکھا ہے۔ اور اس عارضی فانی و بے ثبات دنیا میں کوئی ایک عمل بھی خالص عیش وعشرت کا رہنے ہی نہیں دیا ہے۔ یوم عید بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں آج کا دن احتساب کا دن ہے مہینہ بھر کے حساب کتاب کا دن ہے خوش نصیب ہے وہ جس کا کھاتا آج نیکیوں اور طاعتوں سے لبریز نظر آئے۔

شریعت اسلامی کے اندر گانے بجانے کی بہ طور آرٹ۔ فن یا پیشہ کے کوئی وجہ جواز موجود نہیں اس سرتاپا عمل اور ستوفی صدی حقیقت پسندانہ نظام میں جب عام شاعری بھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھی گئی ہے تو اس قسم کے فنون لطیفہ کا کیا ذکر، لیکن عید ہی کا ایسا موقع ہے کہ اس عام قاعدہ کے اندر کچھ گنجائش بہ طور استثنار نکل آتی ہے۔ رسول اللہ صلعم سے چھوٹی لڑکیوں کا گانا سُننا جو منقول ہے وہ عید کے دن کا ہے ـــــ

---

(۳۰) ہم اپنی وضع کیوں بدلیں[1]؟

ہاں صاحب کیوں بدلیں؟ ایک بار نہیں سو بار کہتے ہیں، کیوں بدلیں؟ وہ تو اپنے طور طریقہ بدلنے کے نہیں، اُلٹی ہم سے فرمائش کہ ہم اپنی وضع قطع ریت رسم یکقلم بدل ڈالیں۔ آخر کیوں بدلنے لگے؟ کیا ہم کوئی ایسے ویسے ہیں؟ ہماری وضعداری گویا کوئی چیز ہی نہ ٹھہری۔ ہماری خودداری کے جیسے کوئی معنی ہی نہ ہوئے! خوب رہی۔ نا صاحب ہم وضع بدلنے والے نہیں، اور ہزار بار نہیں! ——— تو شاعر کا مشہور مصرعہ

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

تو اسی تیکھے طنزیہ مفہوم میں ہے۔ اور اگر اس کی شرح کرنا ہے تو لامحالہ یہی تیور یہی دم خم اختیار کرنے پڑیں گے بہ قول شخصے

شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو!

لیکن شاعری کی خیالی رومانی فضا سے اُتر کر اگر حقیقت پسندی کی ٹھوس زمین پر قدم اُٹھاتے رہنا ہے، تو البتہ یہ بات سنجیدگی کے ساتھ سوچنے سمجھنے

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۔ ۲۹ر جولائی ۱۹۵۲ء کی شام کو ۔ وقت : ۱۴ منٹ۔

کی ہے کہ ہم اپنی گھریلو وضع بدلیں یا نہ بدلیں، اور بدلیں بھی تو آخر کیوں بدلیں؟
لیکن جواب کی منزل سے پہلے ایک لفظی الجھاوا اور ہے۔ پہلے چھٹکارا اسی سے حاصل کیجئے۔ وضع بدلنے کے معنی حاشا وکلا یہ نہیں کہ آپ وضعداری کی شریفانہ عادت چھوڑ دیجئے اور خدانخواستہ بدوضعی کی بستی میں اُتر آیئے!
—— یہ زبان کا جیتا جاگتا عجائب گھر بھی کسی بھول بھلیاں سے کم نہیں۔ معمولی سے لفظ کے مادہ میں ذرا اُگل بچھل کر دیجئے۔ اور معنی و مفہوم کی شگوفہ کاریوں کے مزے لینے لگئے۔ بھلا کہاں 'وضع'، کی سادہ ہیئت ہر رنگ و کیف سے الگ، نہ اس میں نہ اُس میں۔ اور کہاں جو تمکنت کے ساتھ اس پر قائم رہ گئے تو 'وضعداری' کے بام فلک نما پر جا پہنچے۔ اور پھر جو ذرا پھسلے تو ننگ و ناموس لٹاتے ہوئے چٹ 'بدوضعی' کے کوچہ میں آگرے!
توبہ ہے!
اب اس لفظی چکر سے نکل کر آیئے تو سامنا پھر اُسی سوال کا، بال بال ذمہ داری اور سنجیدگی کے ساتھ کہ اپنی گھریلو زندگی میں تبدیلیاں کیوں کی جائیں؟ جواب مختصر سا لیکن کافی یہ ہے کہ کیوں نہ کی جائیں —— اور خیر یہ نفی و اثبات کی بحث الگ رہی، تبدیلیاں تو خودبخود ہو ہی رہی ہیں۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، زمانہ کے موکل کا زبردست ہاتھ تبدیلیاں کرائے بغیر مانتا کب ہے؟ زمانہ کے گزرنے کے معنے ہی یہ ہیں کہ گھر ہو یا باہر، مکیں ہو یا مکاں، جو کل تھا وہ آج نہیں ہے، اور جو آج ہے وہ کل نہ رہے گا۔ بہ قول خواجۂ شیراز۔ ع
چناں نہ ماند و چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند
اور ان سے بھی بڑھ کر عارفانہ مذاق اور ادبی طرح داری رکھنے والے

اکبر الہ آبادی کہتے ہیں، اور وجد میں آکر کہتے ہیں ؎

کیا شان ترے جمال میں ہے

ہر وقت زمانہ "حال" میں ہے

یہ زمانہ کا ہمہ وقتی "حال" ہمارے ہر "قال" و "فعال" سے برتر و بالاتر اور ہماری ہر "چال" بلکہ ہر "خیال" سے تیز تر ہے! ہم لاکھ جامد و منجمد، پتھر کے بت اور لکیر کے فقیر بنے رہنا چاہیں، جب رہنے بھی پائیں!

باپ بیچارہ کس چاؤ سے، کس ولولہ سے گھر بناتا ہے کہ بال بچے اور پھر ان کے بچے کچے، اس میں یوں آرام سے رہیں گے، یوں چین سے گزر بسر کریں گے۔ اور صاحبزادہ سن تمیز کو پہنچے نہیں کہ انھوں نے اس میں ترمیم شروع کردی نہیں۔ یہ دالان تو ابا جان نے بالکل غلط رخ پر رکھا تھا، اور یہ گوشہ تو دیکھئے کیسا بے تکا نکالا، اور لیجئے، جامہ خانہ کے لئے کوئی جگہ ہی نہ رکھی! سو پچاس برس کی کون کہے، دس ہی بیس سال گزرنے پر توڑ پھوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ مذاق طبیعت، پسند اور تکلفات الگ رہے ضروریات تک کا معیار بدل جاتا ہے۔ آرائش و نمائش کو الگ رکھئے۔ راحت و آسائش تک کے پیمانے کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں، نئے نئے ڈیزائن ابھرنے لگتے ہیں، نئے نئے نقشے اپنی بہار دکھانے لگتے ہیں اور نئے نئے نمونے ذہن کی آنکھ کے سامنے گشت کرنے لگتے ہیں۔ چھت اب کی یوں نہیں یوں بنے گی۔ ڈاٹ اب کی ایسی نہیں ایسی لگے گی۔ نقشہ اب کی فلاں مستری سے نہیں، فلاں انجینیر سے تیار کرایا جائے گا۔

یہ روزمرہ کی بیتی ہوئی سرگذشت ہے۔ چند سال کی مدت میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے، اور دنیا والے کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔ دو دسو برس

اُدھر کمرے کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ بڑے بڑے امیروں کی حویلیاں بیگمات اور بادشاہ کے محل تک چھان ڈالئے، سب کھلے ہوئے دالانوں اور شہ نشینوں میں، اور بغیر کواڑ اور دروازہ کے سائبانوں اور دیوان خانوں ہی میں گزر کرتے تھے۔ اور محض پردے ڈال ڈال کر مع اپنے پورے خاندانوں کے ساری زندگی تیر کرلے جاتے تھے۔ لڑکیوں اور داماد، لڑکے اور بہوئیں، بھائی اور بھابیاں سب عروسی، زچگی وغیرہ کے مرحلے کہنا چاہیئے کہ انھیں کھلے ہوئے مکانوں میں طے کرلیتے تھے۔ اب ہم سے کوئی اس طرح کا، بے کمروں والا مکان کہے، تو ہماری سمجھ ہی میں نہ آئے۔ بغیر کمرے کے ننگا بوچا سا مکان بھی کوئی مکان ہوسکتا ہے، اور کمرہ بھی ایک نہیں، اندر باہر ملا کر دو چار تو ہوں۔

زمان کے اثرات مکان پر کیسے نہ ہوں۔ یہ ایک ہلکی سی مثال تو تعمیری تبدیلیوں کی بیان ہوئی۔ اب اس پر قیاس اور دوسری چیزوں کا کیجئے۔ ایک قریب اور سامنے کی چیز مکان کا فرنیچر ہے۔ پہلے مکان کی آراستگی کے لئے فرش فروش تھے۔ معمولی گھروں میں چارپائیاں اور بنس کھٹیاں، چٹائیاں اور دریاں۔ اس سے اونچے ہوئے تو سوزنی اور چاندنی، جاجم اور قالین، تخت اور مونڈھے اور آگے بڑھے تو گدے اور۔

اب جب "صاحب" سے خلا ملا بڑھا اور ان کی تہذیب و معاشرت نے آنکھوں میں چکا چوندھ پیدا کرنا شروع کی، تو چوپالوں، بیٹھکوں دیوان خانوں کے بجائے ڈرائنگ روم سجنے لگے، میز اور کرسیوں کا چلن عام ہوگیا۔ دفتر اور اسکول والے اسٹول اور بنچ اور ڈسک سے نا آشنا نہ رہے۔ اور آگے بڑھ کر کوچ اور صوفے اور آرام کرسیاں، طرح طرح کی آرام دہ

پُرتکلف، مخملی، گدے دار اور کمانی دار کرسیاں بہار دکھانے لگیں۔ کہاں تو جھونپڑیوں کو چراغ اور ڈیوٹ، اور محلوں کو شمع کافوری اور فانوس، جھاڑ اور کنول اور گلی کوچہ کو مشعلیں اور قندیلیں روشن کئے ہوئے تھیں، اور کہاں جب نئی روشنی کی آندھی آئی، تو یہ سب ٹمٹمانے لگے، اور پھر جب دیکھنے والوں کی آنکھ کھلی تو دیکھتے کیا ہیں، کہ پہلے تو مٹی کے تیل کی لالٹینیں اور لیمپ شیشہ کی چمنیوں اور گلوب کے ساتھ، رات کو دن بنائے ہوئے ہیں۔ اور اس کے بعد جو دور آیا تو گیس کے ہنڈے اور بجلی کے قمقمے آسمان کے تاروں پر چشمک زنی کرنے لگے! مکانوں کے در و دیوار پر کہاں تو باپ دادا کے وقت میں بڑی خوشخطی اور صناعی سے لکھے ہوئے قطعے اور طغرے یا مقامات مقدس کے نقشے لٹکتے رہتے تھے، اور کہاں اب جو نئی تہذیب نے پر پُرزے نکالے تو ڈرائنگ روم اور بڈ روم میں ان کی جگہ طرح طرح کی تصویروں اور مرقعوں نے لے لی۔ بعض شائستہ اور شریفانہ، اور بعض بس اب کیا کہا جائے۔ "ناگفتہ بہ" ہی کا جامع لفظ ان کے لئے ہے۔

پرانے تمدن میں بڑی اہمیت کنوؤں کی تھی۔ کنویں کا گھر سے قریب ہونا ہی ایک نعمت تھی، اور کنویں کا گھر کے اندر ہونا تو ایک نعمت عظمیٰ تھی۔ اب شہروں میں اور بڑے بڑے قصبوں میں جہاں کوئی دریا ہے، نل گھروں کے اندر لگ گئے ہیں، اور بجائے قدرتی صاف شفاف پانی کے، مصنوعی ذرائع سے پکایا ہوا، فلٹر کیا ہوا پانی کہنا چاہئے کہ ٹپ ٹپ کر بکنے لگا ہے۔ پہلے امیروں کے مکانوں میں تہ خانے ہوتے تھے، جہاں لو اور تپش کا پورا موسم آرام سے گزارا جاتا تھا، اور صحن میں بلیاں گاڑ کر بڑے بڑے پنکھے ٹانگے جاتے تھے، جن کے نیچے شامیں اور راتیں ہوا کھا کھا کر گزاری جاتی

تھیں، اب بجلی کے پنکھوں نے، کیا چھت والے اور کیا میز والے، اس سارے نقشۂ زندگی ہی کو بادِ ہوائی بنا ڈالا ہے۔

ناچ مجرے کے جلسے پہلے شرفاء کے گھروں میں کمتر ہی جمتے تھے، جب کبھی کوئی جلسہ کرنا ہوتا بھی تو رازداری و انتظام میں کھکیڑ اٹھانا پڑتی۔ اب کچھ مشکل نہیں، ایک ریڈیو سٹ لگا لیجئے" اور گھر کے زنانہ مردانہ میں جہاں بھی چاہیے۔ جس مردانہ و زنانہ طائفہ کی آواز جب چاہیے، مزے سے سُن لیا کیجئے۔ اور کوئی دن جاتا ہے، کہ ٹیلی وژن کی مدد سے جس کسی کے چاہیے" درشن بھی کر لیا کیجئے" گا۔ گویا یہ گوشۂ بساط " فردوسِ گوش" تو بن ہی چکا ہے، اور " جنتِ نگاہ" اب بنا ہی چاہتا ہے ــــــــ پاؤ گھنٹہ کی مدت میں کوئی کیا کیا آپ سے کہے سُنے۔ یہ چند باتیں تو محض نمونہ اور مثالی طور پر عرض کر دی گئیں۔ اسی انداز پر جتنی مثالیں چاہیے خود اکٹھا کرتے جائیے۔ گھریلو زندگی کے اندر یہ سارے انقلابات ہمارے آپ کے دیکھتے دیکھتے ہو گئے اور روزانہ ہو رہے ہیں۔ زمانہ کا ہاتھ کون پکڑ سکا ہے۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں تمدن، معاشرت، تہذیب، تعلیم بلکہ سیاست کی بھی آئے دن کی تبدیلیوں کا اثر ہمارے گھروں کے ظاہر و باطن پر پڑنا لازمی ہے۔ اس سے چارہ نہیں اور نہ کوئی راہ بچنے کی ہے۔ لیکن تبدیلیوں تبدیلیوں میں فرق ہے۔ بعض کو آپ نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے، اور اپنے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے، اور بعض ایسی ہیں کہ آپ ہاں ہاں کرتے ہی رہے اور گھستی ہوئی، پلتی ہوئی، چلی آئیں۔ کوشش اپنی دالی اس کی رکھئے کہ قابلِ قبول صرف انھیں تبدیلیوں کو سمجھیے، جو عقلِ سلیم کے معیار پر پوری اُتریں، اور آپ کی

روایات اخلاق و حکمت کے مطابق ہوں ۔ اندھا دھند ہر
نئی چیز پر نہ گریئے۔ اور نہ ہر نئے نام کے سایہ سے بدکئے۔ سلامتی
کا راستہ عقل و اعتدال والا ہے۔

---

(۳۱) شوق قدوائی: مثنوی گو[1]

کہنے کو تو منشی احمد علی شوق مرحوم نے چھوٹی بڑی مثنویاں بہت سی کہہ ڈالیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ جوانی سے لے کر ضعیفی تک برابر کہتے ہی رہے۔ مثنوی حسن، مثنوی بہار۔ مثنوی برسات، مثنوی طبیعات و مذہب وغیرہا۔ اور اپنی ان دو مثنویوں پر تو انھیں فخر و ناز بھی تھا۔ ایک عالم خیال، دوسری نیرنگ جمال۔ ان کا ذکر اپنی زبان سے بڑے ٹھسے سے کرتے اور اب کیا عرض کیا جائے۔ ان کی داد وصول کرنے اور ان پر تبصرے اور تقریظیں لکھوانے، چھپوانے میں خود کیسی کیسی شاعری برت جاتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ ان کی عمر کے اس دور کی یادگاریں ہیں جب ان کا فن خوب پختہ ہو چکا تھا اور ان کی استادی سب کو تسلیم ہو چکی تھی۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ سخن سنج کی ہر رائے اپنی سخن گوئی کے باب میں معتبر ہی ہو؟ اور یہ کیا فرض ہے کہ حسین خاتون کو اپنی حسن شناسی میں بھی ملکہ حاصل ہی ہو؟

---

[1] دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ۱۲ رجون ۱۹۵۳ء کی شام کو (لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ریکارڈ کیا ہوا)۔ وقت: ۱۴ منٹ۔ دوبارہ ۲۵ رجولائی ۵۳ء کو کشمیر ریڈیو سرینگر سے نشر ہوئی۔

ان کے نام کو اردو مثنوی گویوں کی تاریخ میں مستقل اور باعزت جگہ دینے والی ان کی صرف ایک بہت پرانی مثنوی ترانۂ شوق ہے۔ شوق کی وفات تو ابھی ۱۹۲۵ء میں ہوئی ہے اور یہ مثنوی کہی ہوئی کہیں ۱۸۸۶ء کی ہے جب کہ ان کا سن کل ۲۰-۲۱ سال کا ہوگا۔ گویا بالکل نوجوان۔ اور ایک ہفتہ وار اور اپنے زمانہ کے معیار سے بڑے نیشنلسٹ پرچہ آزاد کی ایڈیٹری میں لگ پھنسے ہوئے۔ عاشقانہ مثنویوں کی بہار تو بس جان عالم پیا کے عہد تک تھی۔ اب انگریزی راج کا شباب تھا۔ مثنویوں کو اب پوچھتا کون تھا۔ خدا جانے شوق قدوائی کو کیا سوجھی کہ اس ناقدری وکس مپرسی کے دور میں یہ زبردست مثنوی ڈھائی ہزار شعر کی کہہ ڈالی۔ منظر کشی میں میر حسن کی بدر منیر کی یاد دلاتی ہوئی صنعت کاری میں دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم کا دامن دباتی ہوئی اور آمد و بے ساختگی میں نواب مرزا شوق لکھنوی کی زہر عشق کی چھب دکھاتی ہوئی!

پہلا ایڈیشن ۱۸۸۶ء میں نکلا۔ دوسرا ترمیم ونظر ثانی کے بعد ۱۹۰۲ء میں اور تیسرا مزید اصلاح کے بعد ۱۹۲۱ء میں! شاعر اپنے کلام پر ہر قیل و قال کو سنتا گیا اور نقد و تبصرہ میں کام کی باتوں کو چنتا گیا۔ اور اس لئے قدرۃً ہر پچھلے ایڈیشن کو پہلے سے بہتر و پاکیزہ تر بناتا گیا۔ اپنے پیش نظر یہی آخری ایڈیشن ہے۔ اور آیئے اس چند منٹ کی صحبت میں اس کی جھلکیاں کچھ اِدھر سے کچھ اُدھر سے دیکھتے چلیں ——— وقت کی ایک چیز تاریخ گوئی تھی۔ اس کتاب کی تاریخ بڑے بڑوں کی کہی ہوئی کتاب میں شامل ہے۔ افضل الدولہ افضلؔ، رحمت اللہ حکیم، فصاحتؔ، امیرؔ مینائی وغیرہ۔ محسنؔ کاکوروی مشہور نعت گو کے نام سے کون ناواقف ہوگا ان کی کہی ہوئی تاریخ اپنے بانکپن میں سب سے بڑھی ہوئی۔ ظلم ہوگا اگر جلدی میں اُسے چھوڑ

دیا جائے ؎

اس قدر شوخ مثنوی محسن — نہ کسی نے سنی نہ دیکھی ہے
روبرو اس زبان اردو کے — فارسی کی تمام ترکی ہے
کس بلندی پر ہے زمین شعر — فلک ہفتمین پہ کرسی ہے
دونوں مصرعے ہیں کیا تڑپتے ہوئے — ایک سیماب ایک بجلی ہے
ہاتف غیب بھی یہ کہتا ہے — بارک اللہ عجیب شوخی ہے

سبحان اللہ! چار چاند لگ جانا اسی کو کہتے ہیں ——— اب اصل کتاب شروع ہوتی ہے اور پرانے دستور کے مطابق حمد الہٰی سے۔ قصہ کا پلاٹ اس کے کہیں بعد شروع ہوگا ؎

اللہ کی حمد ہے زبان پر — ہے آج دماغ آسمان پہ
وصف اسکے لکھیں جو لکھنے والے — کونین کے دو ورق ہوں کالے
دی منھ کو زبان، زبان کو تقریر — پتلی کو نظر، نظر کو تسخیر
شب کو کیا روز، روز کو شب — لب کو دئے حرف، حرف کو لب
پھول اس نے کھلائے کھلتے ہیں روز — دو وقت ملائے ملتے ہیں روز

سلاست، آمد، روانی کو چھوڑیئے۔ حمد اتنی دل نشین یا معاصر شاعر حالی کی زبان میں "نیچرل" کم تر ہی کسی کے قلم کو نصیب ہوئی ہوگی۔ اور حمد کے معاً بعد نعت، سادگی، اثر، بے ساختگی کی ایک بولتی ہوئی تصویر ؎

ہے وصف جناب احمدؐ پاک — لولاک لما خلقت الافلاک
کونین کا حصر دم پہ ان کے — معراج کا سر قدم پہ ان کے
منظور نظر جو چار تھے یار — کاشانہ دین کے تھے ستون چار

منقبت صحابہؓ، اہل بیت سب اسی رنگ میں ہے۔ اس سے گزر کر

منزل مناجات آتی ہے اور یہاں شوق کی شاعری گلزار نسیم کے نقش اول پر نقش ثانی کی بہار دکھاجاتی ہے ؎

یارب مجھے قوت بیان دے — منھ میں شمشیر کی زبان دے
بازوے قلم میں زور و فن ہو — قبضہ میں قلم روے سخن ہو
دیکھے جو بیان کی روانی — سوکھے بحر رواں کا پانی
گہرا جو یہ رنگ شاعری کا — رنگ لب سرخ ٹھہرے پھیکا
ہو رشک یہ چستی سخن پر — ڈھیلی ہو قبائے نازنین پر

نفس قصہ میں کوئی جدت یا ندرت نہیں، پلاٹ وہی پامال اور بار بار کا دُہرایا ہوا۔ ایک شاہ جم جاہ ہیں بڑی آن بان کے۔ بڑی شوکت و شان کے۔ لیکن اولاد کی دولت سے محروم، آخر بعد مدت شجر امید میں ثمر آیا۔ بادشاہ کی مسرت اور پھر جشن مسرت کا کیا پوچھنا اپنے چاند کا نام ماہ عالم رکھا ؎

بوٹے سے نہال ہو گیا شاہ — تارے نے ہلال کو کیا ماہ
لعل و زر و سیم سب منگایا — بانٹا، بخشا، دیا، لٹایا
تھا وہ نور نگاہ عالم — رکھا گیا نام ماہ عالم

آگے شہزادہ کے جمال و کمال کا مرقع ملاحظہ ہو۔ حسن ہے لیکن مردانہ اور کمالات حسب اقتضائے زمانہ ؎

حصہ میں تھی آبرو کی ہر شئے — تھا رزم میں شمع بزم میں مے
دانش میں خیال نکتہ یابان — بینش میں نگاہ بے حجابان
رنگین سخنی میں لعل احمر — شیریں دہنی میں حوض کوثر
انجم ان کی جبین کا ایک پرتو — شان ان کے چراغ بخت کی لو

رفعت کوٹھے کا ایک زینہ دولت خاتم کا ایک نگینہ
طاقت چٹکی میں صورت تیر نصرت قبضہ میں مثل شمشیر
عقل اتنی بڑھی کہ زلف گھٹ جائے عمر خضر و مسیح کٹ جائے

اللہ اللہ تشبیہوں کی یہ ندرت و روانی اور پھر یہ کثرت و فراوانی کہ جیسے ابلی پڑتی ہیں! ____ قصہ کا ورق آگے اُلٹیے ____ ایک تاجر صاحب وارد ہوتے ہیں اور مال تجارت کے ساتھ ایک پیکر حسن وجمال شہزادی کی تصویر بھی دکھا جاتے ہیں ؎

بولا شہزادہ چشم بد دور ہے یہ کس کی نگاہ کا نور
کس برج کے چاند کی یہ ضو ہے کس گھر کے چراغ کی یہ لَو ہے

یہ چراغ خانہ جو قصہ میں آکر شمع محفل بننے کو ہیں ان کی سراپا نگاری میں شاعر نے کمال حسن زنانہ کی مصوری کا دکھایا ہے۔ سراپا نگاری تو ہمارے مثنوی نگاروں کا خاص جوہر ہی رہا ہے۔ لیکن اب ذرا چابک دستی اس باکمال کی بھی ملاحظہ ہو ؎

تن میں جو ہے بوئے بادۂ حسن وہ سر ہے سبوئے بادۂ حسن
ہے جلوہ نما وہ مانگ سر پر گویا شمشیر ہے سپر پر
بال اس کے جو آنکھوں میں نظر آئیں قسمت میں بلا کے پیچ پڑ جائیں
آنکھیں ہیں بیاض سحر خوانی یا ساغر بادۂ جوانی
جادو ڈالیں تو صاف چل جائے رنگ ابلق دہر کا بدل جائے
لب ایک ہے "با" تو دوسرا "تا" دونو جو ملیں تو بت ہو پیدا
بت بن کے وہ سنگدل نہ بولے عیسیٰ بھی جو بولیں لب نہ کھولے
شانے جو ہیں دونو بازوؤں پر دو ہیں مینا تو دو ہیں ساغر

گورا ہے بدن تو نہر کہیے　　ہر ہاتھ کو ایک لہر کہیے

بلور کے برجوں کا ذکر ناگزیر تھا۔ پرانے مثنوی گویوں سے لے کر آج کے ترقی پسندوں تک خدا معلوم کتنوں نے کیا کچھ کہہ ڈالا ہے۔ شوق پامال تشبیہوں سے بچتے ہوئے اپنی جدت و تازگی تخیل کا نمونہ پیش کرتے ہیں ؎

یا میوہ نخل زندگانی　　یا محمل ناقہ جوانی

بے خود تھے شراب پینے والے　　مستی میں الٹ دئے پیالے

لیجئے اس حسن بیان و لطف زبان کے چسکے میں پڑ کر وہ اصل قصہ تو رہا ہی جاتا ہے۔ بادشاہ کو پرچہ لگا کہ شہزادہ پر ایک پری وش کے عشق کا جن سوار ہے۔ بہت بگڑے، گرمائے، جھلائے۔ کچھ اثر نہ ہوا۔ درباریوں کی عقلیں چکرائیں کہ اب کیا کیا جائے۔ ایک روشن ضمیر، مشیر با تدبیر بن کر نمودار ہوئے اور پیام عقد بھجوانے کی سجھائی۔

مجمع میں تھا ایک پیر دانا　　دیکھے ہوئے آنکھوں سے زمانہ

کوچہ میں جو رہبری کے آئے　　ہو خضر تو راستہ بتائے

صورت میں کمان فکر میں تیر　　بہر شب غم سحر تھا وہ پیر

نامہ بری کی خدمت انھیں سوداگر صاحب کے سپرد ہوئی اور شاہ ذی جاہ نے قاصد سے اپنے ہونے والے سمدھی کے حق میں کچھ ہدایتیں زبانی بھی کیں ؎

خسرو کو تنبیہ و نامہ دینا　　کہنا سننا جواب لینا

ہو سخت تو بولنا بہ نرمی　　ٹھنڈا کرنا کرے جو گرمی

کچھ راگ جو لائے ساز رکھنا　　پرواز کرے تو باز رکھنا

ہزار حسینوں کا ایک حسین تو خود وہ شہزادہ تھا۔ دیکھنے والوں نے جو تصویر دیکھی تو خود بُت بن کر دیکھتے رہ گئے۔ قاصد جواب باصواب پاکر خوش وخرم لوٹا اور شاعر صاحب کے ذہن کی پروازنے اس دور ذہن میں بھی قاصد کے پر لگا دیئے ؂

کاغذ جو ملا ہوا تھا قاصد — تیز آہ سے کچھ سوا تھا قاصد
دم چلنے پہ منفعل ہوا اس سے — عمر گزران تخجل ہوا اس سے
جنگل جو پڑا ہوا تھا راہی — دریا جو ملا تو تھا وہ ماہی
گو گرم روی بہت جتائے — سورج کی کرن نہ اس کو پائے

شہزادہ صاحب بڑے خوش خوش ایک لاؤ لشکر ساتھ لے دیار حبیب کو چلے۔ راہ کی ایک منزل میں رات کیا آئی ایک بلا آئی۔ پریوں کا تخت ادھر سے گزرا اور مشتری پری شہزادہ کے حسن وجمال کی خریدار بن اسے سوتے میں اپنے ساتھ اُڑا لائی۔ آنکھ کھلی تو نظروں میں اندھیرا چھا گیا ؂

آنکھیں جو کھلیں نصیب سویا — کانپا، سہما، غریب رویا

مشتری اس کے حق میں زحل نکلی۔ کھیلی کھائی ہوئی، اڑتی چڑیا کے پر گننے والی تھی، لیکن بشر کے عشق میں مبتلا ہوکر بوکھلا گئی ؂

ماہر ہوئی جامہ کے ہوس میں — لیں اسکی بلائیں دیکے اسکو قسمیں
یاں دل کو ہوا جو اور کی تھی — کانٹا سی پری کھٹک رہی تھی
پھیلی وہ تو یہ سمٹ کے بیٹھا — آگے جو بڑھی تو ہٹ کے بیٹھا

اب وہ مشتری نہیں مریخ تھی۔ شہزادہ کو ایک کنوئیں میں قید کردیا۔ اب اور طرح طرح کے کچوکے زبان سے دیئے ؂

دھن اور تھی اور راگ نکلا پانی تجھے سمجھی آگ نکلا
تو مجھ سے نہ اڑ کہ میں پری ہوں روشن ہے کہ آگ سے بنی ہوں

سارا قصہ اب کہاں تک کہئے۔ حاصل یہ کہ ایک درویش کی مدد سے شہزادہ کو زندان چاہ سے رہائی نصیب ہوئی لیکن ابھی اور کتنے کنویں جھانکنے مقدر میں تھے۔ خاک پھانکتے اور سب کچھ جھیلتے جھالتے ماہ عالم آخر دیارِ یار تک پہنچتے ہیں۔ سارا شہر پیشوائی کو ٹوٹ پڑا ہے

دو نکلے اِدھر سے چار اُدھر سے دوڑے کہ بلائیں لیں نظر سے

شہزادی کی ایک سہیلی نے پوشیدہ ملاقات کا انتظام ایک باغ میں کرا دیا۔ شوق بیباک کے مقابلے میں عصمت مآبی کا رکھ رکھاؤ اس تخلیہ کی مجلس میں ملاحظہ ہو ؎

یاں پردۂ چشم ہو گئی شرم پہلو وہاں شوق نے کیا گرم
یاں جھک کے نظر زمیں پہ پہونچی واں چشم ہوس جبیں پہ پہنچی
ملتے ہی کھلیں ہوس کی راہیں للچائی ہوئی پڑی نگاہیں
آمادہ ہو شر پہ، خیر ہے کچھ میری عزت سے بیر ہے کچھ
مریم کی قسم ہوں پاک دامن چھونے نہیں پاتی خاک دامن
پتے نہ کہیں پتا بتا دیں چڑیاں نہ کہیں خبر اُڑا دیں
لب نہر کے کچھ نئے نہیں ہیں اور یہ مصرع ہوا ہے ع ــــــ
چشمے کمبخت دوربیں۔ ہیں۔

بارات کا انتظام، شاہانہ تزک و احتشام وہ اس کی دھوم دھام ــــــ اصل کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ یہ راگ یہاں کہیں اگر چھڑا تو عجب نہیں کہ نثر گاہ خود ایک بزم نشاط کا رنگ اختیار کرے تاہم آتشبازی

کے سمان میں ایک آدھ پھلجھڑی تک مضائقہ نہیں ؎

آتش بازی وہ رنگ لائی — چھوٹی مہتاب پر ہوائی
گولے کی صدا سے توپ حیراں — بہرے ہوں سنیں جو رعد کے کان
چرخی لیلیٰ کی چشم بے باک — چکر یا بخت قیس غمناک
اونچے گئے اس قدر غبارے — کچھ بڑھ گئے آسماں کے تارے

اور ایک ہلکی اچٹتی سی نظر محفل ارباب نشاط پر ؎

رقصاں ہوئیں رنڈیاں وہ آکر — پریوں کو نچائیں گت بنا کر
زہرہ کو یہ چوٹ یہ جلن ہو — پیٹے گاتی پھرے سٹرن ہو
بلبل گائے ہزار جی سے — منھ بند کر دیں وہ گٹکری سے

رہا وہ منظر ہوا صلت جہاں ہمارے سب ہی شاعر، کیا نئے اور کیا پرانے، کیا جوان اور کیا بوڑھے، خوب ہی کھل کھیلتے ہیں سو اس پردہ کی بات پر تو آج کی رات پردہ ہی پڑا رہنے دیجئے۔ شاعر نے کلام کا آغاز حمد و مناجات سے کیا تھا خاتمہ کا انداز بھی کچھ دعائیہ ہی سا ہے ؎

نیرنگ سخن دکھا چکا تو — سر سجدہ کو اے قلم جھکا تو
مقبول ہو یہ فسانۂ شوق — ہر بزم میں یہ ترانۂ شوق
شاخیں نکلیں نہ اس بیان میں — پھولے پھلے گلشن جہان میں
نکلے یہ زبان اہل فن سے — لعل اگلے ہیں شوق نے دہن سے
روشن ہو یہ خوبی معانی — قصہ یوسف کا ہو کہانی
ارباب سخن کریں مری قدر — چمکا کے بنائیں ذرہ کو بدر
میں ملک سخن میں کچھ نہیں ہوں — ہاں کشت سخن کا خوشہ چیں ہوں
جتنی میرے سخن کی ہے دھوم — سب ہے فیض اسیر مرحوم

تعلی و انکسار، دعوئ اور باز دعوئ کی یہ خوشگوار آمیزی دفتر شاعری میں کم ہی کسی کے قلم کے نصیب میں آئی ہوگی۔

(۳۲) اردو میں ادبی سوانح عمریاں[1]

اردو میں ادبی سوانح عمری کی عمر کچھ ایسی طویل نہیں۔ ۶۰، ۶۵ برس کی عمر والوں سے پوچھ کر دیکھئے۔ جب انھوں نے دنیا میں آنکھ کھولی تو کان اس نام ہی سے نو آشنا تھے۔ مولوی حالیؔ۔ جن کی قسمت میں بجائے شمس الشعراء کے شمس العلما بننا لکھا تھا، پہلے شخص ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اس طرف توجہ فرمائی۔ اور سب سے پہلا ہیرو جوان کی نگاہ انتخاب میں چڑھا۔ وہ ایران کے شیخ سعدی شیرازی تھے۔ یہ ۱۸۸۶ء کی بات ہے، جب حیات سعدی وجود میں آئی۔ اور اردو پہلی بار کتابوں کی ایک نئی صنف سے آشنا ہوئی۔ حالیؔ آگے چل کر خود 'سعدی ہند' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اور کہنے والوں نے تو لاابالی پن سے کام لے کر یہاں تک کہہ ڈالا کہ سعدی کی جانشینی کا حقدار ہندوستان میں اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ حالیؔ ہی ہیں۔ بات بے اصل تو نہیں ہے۔ لیکن ہے خاصی شاعرانہ اور مبالغہ آمیز۔ سعدی کے جہاں تک

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۳ء کی شام کو۔ وقت: ۱۵ منٹ۔

پند نامہ، اور گلستان و بوستان کے بیشتر حصوں کا تعلق ہے۔ حالی بیشک اپنے پیرو کے رنگ پر ہیں۔ وہی تفاہت وہی متانت۔ وہی پند و موعظت۔ وہی طریقت و معرفت۔ لیکن جہاں استاد سعدی کا اشہب قلم کلیات کے مضحکات و مطائبات میں اور گلستان کے باب پنجم میں شوخی و ظرافت کے حدود پھاند کود کر کے صریح عریانی و فحاشی کے میدان میں طرارے بھرنے لگا ہے۔ وہاں حالی بیچارہ کی تو کیا بساط ہے۔ اکبر اور سرشار اور سجاد حسین کے منہ زور ٹٹو بھی کہیں پیچھے رہ رہ گئے ہیں ـــــ ہاں تو انھیں حالی نے سعدی کی سوانح عمری کچھ کم ڈھائی سو صفحات کے حجم کی لکھ دی۔ اور اپنے بعد کے آنے والوں کے لئے ایک نئی راہ کھول دی۔ کتاب میں شیخ کے شخصی حالات کا ایک مختصر تذکرہ ہے اور سنجیدہ کلام پر مختصر لیکن جامع تبصرہ۔ اور کتاب لکھنے کا مقصد دلوں میں سعدی کی عظمت پیدا کرنا اور ان کی روش پر چلنے کا شوق دلانا ہے۔ کتاب اچھی خاصی سلیس و شستہ زبان میں ہے، اور انیسویں صدی کے آخری دہے کی نستعلیق اردو کا نمونہ ہے۔

اردو کی دوسری ادبی سوانح عمری بھی اتفاق سے انھیں مولوی حالی کے قلم سے ہے۔ اور یہ ان کے استاد شعر حضرت غالب پر ہے۔ یادگار غالب کے نام سے ہے۔ ذرا چھوٹی تقطیع پر کوئی سوا چار سو صفحات کے حجم کی۔ غالب کو گزرے ہوئے اس وقت ۲۰، ۲۲ سال ہو چکے تھے۔ اور کوئی مستقل کتاب نہ ان کے اردو یا فارسی کلام پر نکلی تھی اور نہ کسی اور کمال پر۔ ہاں شاعروں کے جو عام تذکرے لکھے گئے تھے۔ ان میں ضمناً ان کا بھی نام و کلام آگیا ہو۔ تو اور بات تھی۔ حالی کا قلم بھی اب ذرا اور منجھ چکا تھا، اور پھر سعدی کی طرح یہاں جگ بیتی کی تلاش نہ تھی۔ آپ بیتی کا معاملہ تھا، شنید

کی نہیں، دید کی محفل آراستہ کرنا تھی۔ اور روایت سے زیادہ رویت کو قلم کا جامہ پہنانا تھا۔ کتاب لکھی اور خوب لکھی۔ مرزا کی زندگی کی بھی جیتی جاگتی تصویر پیش کردی۔ ان کا حلیہ، لباس، وضع قطع۔ ان کا علم و فضل، اُٹھنے بیٹھنے کا طریقہ۔ کھانے پینے کے شوق۔ ان کی شوخی و بذلہ سنجی، جو چاہیے اس جیبی آئینہ میں ملاحظہ فرمالیجئے۔ ساتھ ہی ان کی تصنیفات نثریہ اور ان کے فارسی اور اردو کلام پر جچا تلا تبصرہ ایسا کہ اسے پڑھ کر ایک مبتدی بھی غالب فہمی اور غالب شناسی میں دخیل ہوجائے۔ اس کا جلوہ بھی اس مرقع میں دیکھ لیجئے —— کوئی ایسا نمونہ آپ دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس سے مرزا اور حالی دونوں کے یادگاری پہلوؤں پر روشنی پڑجائے؟ اچھا تو حاضر ہے۔

خواجہ حالی ابھی جوان ہیں۔ اور مذہبی حرارت میں تشدد بلکہ تقشف کی حد کو پہنچے ہوئے ادھر مرزا اپنی بدمذہبی اور رندی کے لئے رسوا و بدنام اور کانوں سے بھی بڑی حد تک معذور۔ ایک روز کیا کیا کہ اپنے اُسی مذہبی جوش میں ایک بڑا سا پند نامہ گھسیٹ کر مرزا کے سامنے پیش کردیا اور ان کی عمر مرتبہ وغیرہ کا بھی کچھ لحاظ نہ رکھا۔ اب آگے جو گزری اسے حالی ہی کی زبان سے سنئے:۔

"مرزا صاحب نے میری لغو تحریر کو دیکھ کر جو کچھ فرمایا وہ سننے کے لائق ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ ساری عمر فسق و فجور میں گزری۔ نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا۔ نہ کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں۔ اب اگر چند روز بیٹھ کر یا ایماء و اشارہ سے نماز پڑھی بھی تو ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیونکر ہوسکے گی؟ میں تو اس قابل ہوں

کہ جب مروں میرے عزیز اور دوست میرا منھ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر لے جا کر کتوں اور چیلوں اور کوؤں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارا کریں) چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔ لاالٰہ الا اللہ لاموجود الا اللہ لاموثر فی الوجود الا اللہ۔"

اس ٹکڑے سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ مرزا جب انکسار و اعتراف قصور پر آتے۔ تو اس وقت بھی شاعری و مبالغہ آرائی سے نہ چوکتے۔ بھلا یہ بھی کوئی سچائی ہے کہ انھوں نے عمر بھر میں ایک بار بھی نماز نہیں پڑھی۔ اور زندگی بھر ایک بھی نیک کام نہ کیا؟

تیسری اردو کتاب اسی صنف کی۔ یہ بھی عجیب اتفاق در اتفاق کہ انھیں خواجہ حالی ہی کے قلم سے ہے۔ یہ خواجہ صاحب بھی اردو کے حق میں بڑی رقم نکلے۔ اس تیسری کا نام ہے حیات جاوید سرسید کی لائف ان پہلی دو کتابوں سے مشہور تر ہی نہیں، ضخیم تر بھی ہے۔ اور کیسی ضخیم کہ ان دونوں کے مجموعہ سے بھی ضخیم تر۔ ۲۰ × ۲۶ کی تقطیع پر ساڑھے آٹھ سو صفحوں سے اوپر۔ یہ ٹھیک ہے کہ سرسید اکیلے ادیب کہاں تھے۔ سیاسی رہبر تھے۔ تعلیمی لیڈر تھے۔ مذہبی رفارمر تھے۔ لیکن بہر حال ان کی ایک اہم حیثیت اچھے مصنف اور ادیب کی بھی تھی۔ اور اور محض ادیب ہونا کیا معنی وہ ادیب گر تھے۔ نہ معلوم کتنے ان کے

نقش قدم پر چل چل کر خود ادیب و اہل قلم بن گئے۔ حیات جاوید قدرۃً دو حصّوں میں تقسیم ہے۔ ایک میں ذاتی و شخصی حالات اور دوسرے میں ان کے پبلک کارنامے۔ ان دونوں حصوں میں ملا کر پچاسوں صفحات سرسید کی ادبی، صحافتی، علمی خدمات کے لئے وقف ہیں۔ حالی اب ایک کہنہ مشق اہل قلم ہو چکے تھے اور پختہ کار سوانح نویس۔ قدرۃً آپ کو خوب مقبولیت حاصل ہوئی۔ چمکی۔ پھیلی۔ ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اور ایک ستارۂ نور بن کر دوسرے لکھنے والوں کے لئے مثال اور نمونہ کا کام دینے لگی۔

دو ایڈیشن تو غالباً حیات سعدی کے بھی نکلے۔ باقی ان دونوں کتابوں کے تو یقیناً ایک سے زائد ایڈیشن نکل چکے ہیں —— دوسرے ایڈیشن کے قابل ذکر ہونے پر حیرت نہ کیجئے۔ یہ فرنگستان نہیں ہے۔ جہاں دس دس بیس بیس ایڈیشن بات کی بات میں نکل جاتے ہیں۔ یہ ہمارا ہندوستان ہے۔ یہاں کسی سنجیدہ علمی ادبی کتاب کے دو ایڈیشن بھی نکل جائیں، تو سمجھئے کہ بہت نکلے۔

نفس سوانح عمریوں کا ذکر نہیں۔ اردو میں ان کی کل کی تعداد خاصی بڑی ہے۔ مولانا شبلی اور ان کے شاگرد ان رشید کا تو حاصل عمر کہنا چاہیے کہ سوانح عمریاں ہی ہیں۔ اور ایک بڑی حد تک مولانا شرر کا بھی۔ لیکن اس وقت گفتگو عام سوانح عمریوں پر نہیں صرف ادبی سوانح عمریوں پر ہے۔ ان کی تعداد ان تین معلوم و معروف کتابوں کے علاوہ اب تک بھی بس گنی ہی چنی ہے۔ لیکن ان میں سے دو ایسی ہیں کہ ان کا نام لئے اور سرسری اُچٹتا ہوا ذکر کئے بغیر اس گفتگو کو تمام کر دینا۔ اس کو ناتمام رکھنا ہے۔

ایک کا نام ہے حیات النذیر۔ شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد مترجم القرآن و مصنف توبۃ النصوح و مراۃ العروس وغیرہ کے نام نامی اور ادبیات اردو میں ان کی بھاری بھرکم شخصیت اور پر رعب مرتبہ و منزلت سے کون ناواقف ہے؟ اس شیر بیشۂ ادب کی سوانح عمری سید افتخار عالم مارہروی کے قلم سے۔ ڈبل اور گراں ڈیل اتنی کہ ۲۲×۲۹ سائز کے، ۲۷ سطری مسطر پر ساڑھے چھ سو صفحات سے اوپر میں آسکی ہے۔ نذیر احمد کی اصلی حیثیت مصنف و ادیب ہی کی تھی۔ اس لئے ادبی سوانح عمریوں کی صف میں شامل ہونے کی یہ حیات جاوید سے بھی بڑھکر حقدار ہے۔ اور مؤلف نے کمال یہ کیا ہے کہ ہیرو کے رنگ سے اپنا رنگ ملا دیا ہے۔ اور اپنے بیان و زبان پر نذیر احمدیت اتنی طاری کر لی ہے کہ اچھے اچھے مبصر اور صاحب نظر نقادوں کو یہ بدگمانی پیدا ہوگئی کہ عبارتوں کی عبارتیں کہیں نذیر احمد بہ قلم خود تو نہیں! کتاب میں مولانا کا فوٹو بھی شامل ہے۔ لیکن مؤلف کے قلم کا کمال یہ ہے کہ لفظ و عبارت کی مدد سے اس نے جو تصویر اپنے ہیرو کی تیار کی ہے، وہ "نقل مطابق اصل" ہونے میں اس فوٹو سے کچھ کم نہیں!

سلسلہ کی آخری کتاب ہے حیات شبلی۔ جس کے مصنف مولانا سلیمان ندوی کی مفارقت کا داغ ابھی دل پر بالکل تازہ ہے۔ ضخامت میں کسی سے بھی دبی ہوئی نہیں کوئی ساڑھے آٹھ سو صفحہ کی ہے۔ فہرست مضامین خوب مفصل اور اشخاص کے نام کی انڈکس بھی شامل۔ شبلی اس زمانہ کے مصنّفین کے گویا ابو الآباء ہیں۔ ان کے شاگرد اور پھر شاگرد در شاگرد اردو کی سنجیدہ قلمی دنیا پر دیکھتے ہی دیکھتے چھا گئے۔ ان کی سوانح

عمری کو قدرۃً دوسروں کے لئے مشعل راہ ہونا ہی چاہئے تھا۔ دیباچہ و مقدمہ کے طول و عرض نے وقت کی ساری اسلامی تعلیمی تاریخ کو سمیٹ لیا ہے شبلی کی داستان اور داستان گو ان کا رشید ترین شاگرد و جانشین سید سلیمان، پڑھنے والا محو اور گم ہو کر نہ رہ جائے۔ تو کیا کرے۔ جا بجا سر سید سے نوک جھونک بھی۔ پھر بھی کتاب کی عام دلکشی ذہن کا ادھر التفات ہی کب ہونے دیتی ہے! شاگرد نے اپنی شخصیت کو بہت چھپایا اور صیغۂ متکلم کو نفس امارہ کی طرح دبایا، گھٹایا۔ مٹایا ہے۔ لیکن واقعات و حالات کی اس زبردست منطق کو کیا کیجئے کہ حیات شبلی ایک خاصی حد تک خود بخود سیرۃ سلیمانی بھی بن گئی ہے۔ بہ قول شخصے

خود مصوّر بھی کھنچا آتا ہے تصویر کے ساتھ!

گنانے کے لئے ابھی اور بھی کتابوں کے نام لئے جا سکتے ہیں لیکن فن کے نام کو اونچا کرنے والی اردو میں یہی پانچ ہیں اور انھیں کے تذکرہ اور سرسری تبصرہ کو اس 'پنج گنج' کی تائے تحت خیال فرمائیے۔

———— ⁂ ————

(۳۳) میر تقی میرؔ

سُنئے صاحب۔ میرؔ کی کہانی جو آپ کو سُنانے کو ٹھانی، تو کانوں میں خود بخود ایک صدا آنے لگی ؂

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ — اُس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

یہ کون غالبؔ ہیں؟ وہی اکبر آبادی ثم دہلوی، جو اچھے اچھوں کو خاطر میں نہ لاتے، اور بڑے بڑوں کی خبر لے ڈالتے۔ اور دوسروں کی داد دینے میں نہ مُسرف نہ فیاض، بلکہ کچھ کنجوس اور بخیل ہی سے گنے جاتے تھے! اچھا تو یہ داد اُن کی زبان سے! —— ابھی کیا ہے صدا تو آئے جا رہی ہے۔ اور آگے سُنئے ؂

ریختہ کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ — کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میرؔ بھی تھا!

اب آنکھیں ایک اور منظر سے دوچار ہوتی ہیں۔ سامنے سے مرزا صاحب خراماں چلے آ رہے ہیں، عجب کیا جو کسی مشاعرہ کو جا رہے ہوں، اور یا نہیں لکھنؤ کے استاد شیخ ناسخؔ کے گلے میں پڑی ہوئی ہیں۔ زیر لب کچھ گنگنا رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؂

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

یہ داد پرداد مل ہی رہی تھی کہ ایک طرف سے اُستاد ذوقؔ آتے ہوئے دکھائی دیے، ہاتھ میں پھولوں کی ایک بدّھی ہے۔ ان کی چشمک غالبؔ سے مشہور ہے۔ بعید نہیں جو اُن کی ضد میں آکر یہ دن کو رات کہنے پر تُل جائیں۔ لیکن یہ کیا؟ انھوں نے وہ ہار تو غالبؔ ہی کے ممدوح کے گلے میں ڈال دیا خوشبو سے آپ بھی لطف لیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اب غالبؔ اور ناسخؔ اور ذوقؔ تینوں استاد مل کر جب کسی کی استادی کا کلمہ پڑھنے لگیں، اور بزم سخن میں اس کی سروری اور میری کا دم بھرنے لگیں تو اب شاعروں کی اس رائے کو شاعری کیوں کہیے، اس پر تو تاریخیت کی مُہر لگا کر رہیے!

مشاعروں کی محفل کو چھوڑ کر تذکرہ نویسوں کے کوچہ کی طرف آیئے۔ میر تقی کے مزاج و طبیعت میں جس نے جو چاہے فی نکالی ہو، اُن کی بد مزاجی اور بد دماغی کی جو بھی حکایت روایت اچھالی ہو، لیکن اُن کے کمال فن کا اعتراف سب کو ہے۔ اُن کے مرتبہ استادی سے کو رسب کی دبی ہوئی ہے، دیکھیے نہ، یہ انھیں "میر شعرائے ہندوستان اور افصح فصحائے زماں" کہہ کر کون پکار رہا ہے؟ یہ میر حسن دہلوی ہیں۔ اِن کے ہاتھ میں "نگین خاتم سخن آفرینی" کی انگشتری کون پہنا رہا ہے؟ یہ مرزا علی لطف صاحب "لطف سخن" ہیں۔ اور یہ ان کے سر پر "افصح فصحا اور اشعر شعرا" کا تاج زرّیں رکھنے کے کون صاحب چشم براہ ہیں؟ یہ حضرت شیفتہ صاحب "گلشن بے خار" ہیں! غرض مدح میر کا قصیدہ ہے

بڑا طویل ۔

وقت کوتاہ و قصہ طولانی

کہاں تک سنائیے اور کہاں تک سنئے !

یہ میر صاحب تھے کہاں کے؟ کس خاک سے اُٹھے اور کس خاک میں ملے؟ عمر کوئی نوّے ۹۰ سال کی پائی ۔ آنکھ اکبر آباد کی سرزمین پر کھولی۔ یہیں پلے، بڑھے، کھیلے کودے ۔ قدم نوجوانی کی دہلیز پر رکھا ہی تھا کہ دِلّی کی کشش نے زور دکھایا۔ آئے اور جیسے یہیں کے ہو گئے۔ جوانی کی چڑھی ہوئی کمان ابھی اُتری ہی تھی کہ آصف الدولہ کی قدردانیاں پیشوائی کے لئے بڑھیں، اور لکھنؤ کھینچ لائیں۔ اور سعادت علی خاں کے زمانہ میں یہیں تربت کو آباد کیا۔ اس حساب سے میر اکبر آبادی ثم دہلوی ثم لکھنوی ٹھہرے ۔ اقلیم اردو کے تینوں مقامات مقدسہ کے مکیں۔ تراب یک آتشہ کیا معنی دو آتشہ بھی نہیں، سہ آتشہ ! ـــــ کلام پر اثر تینوں کے مقامی خصوصیات کے موجود ۔ اکبر آبادیوں کے انداز بیان کی سلاست، دہلی والوں کی معنوی بلاغت، لکھنؤ کے روزمرہ کی نزاکت، اس آئینہ میں یہ سارے نقش نمایاں ۔ وفات ۱۲۲۵ھ ہجری مطابق ۱۸۱۰ء میں ہوئی اور عمر ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ ۹۰ سال کی پائی ۔ کلام کا بڑا حصہ یوں سمجھئے کہ آج ۱۹۵۴ء میں ڈیڑھ دو سو سال کا پرانا ہے ۔ تازگی کا یہ عالم کہ اتنی کہنگی کا یقین کسی طرح نہیں آتا ـــــ

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا	دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا	دل کے جانے کا نہایت غم رہا
یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ	نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

مستی میں چھوڑ دیر کو کعبہ چلا تھا میں
لغزش بڑی ہوئی تھی ولیکن سنبھل گیا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے فلک
اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا!

سجہ گرداں ہی ہم تو میرؔ رہے
دستِ کوتاہ تا سبو نہ گیا!

اب تو جاتے ہیں میکدہ سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا!

سمجھے تھے ہم تو میرؔ کو عاشق اسی گھڑی
جب نام تیرا سن کے وہ بیتاب سا ہوا

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
کہنے کی یہ باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا

اسی طرح کے کتنے شعر اردو کے ذخیرۂ ادب میں شامل ہو کر بلکہ گھل مل کر ضرب المثل کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔ انھیں پڑھ کر کوئی بھی خیال کر سکتا ہے کہ میر صاحب آدمی اس بیسویں صدی کے نہیں اٹھارویں صدی کے تھے اور انیسویں صدی کے تو بس چھونے کے گنہگار تھے۔

میرؔ عالی خاندان والا دودمان تو تھے، صحبت درویشوں اور صوفیوں کی اٹھائی۔ ذاتی شرافت کے سونے پر اس خانقاہی اثر نے سہاگہ کا کام دیا۔ پھر جو جو تکلیفیں عزیزوں دوستوں کے ہاتھوں اٹھائیں۔ وہ اس سونے کو اور تپاتی گئیں کھوٹ دور ہوتا گیا اور سونا جلا پر جلا پاتا گیا۔ عزیزوں میں بعض صاحب نسبت درویش پہلے ہی سے موجود تھے۔ میر تقی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نیم درویش بھی ہو گئے۔ کلام سے یہ جوہر ٹپکا پڑتا ہے۔ خصوصاً درد و غم، حزن و الم، عبرت و شکستگی ــــــ

ردیف

الف میں تو ایک پوری غزل کہنا چاہیے اسی رنگ کی ہے اور وہ غزل ہے بھی ذرا چلتی ہوئی ۔ دو چار شعر تو ضرور ہی کان میں پڑ چکے ہوں گے ؎

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ غم نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
جو چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اُن کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا
یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

ایک اور غزل ردیف نون میں اسی رنگ سے ملتی جلتی ؎

ملنے لگے جو دیر دیکھئے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندہ میں کچھ رہا نہیں
بوئے گل اور رنگ گل دونوں ہیں دلکش اے نسیم
لیک بہ عذر یک نگاہ دیکھئے تو وفا نہیں
ناز بتاں اُٹھا چکا دیر کو اب تو ترک کر
کعبہ میں جا کے رہ میاں تیرے مگر خدا نہیں

دو چار شعر اور اسی وضع قطع اور انھیں تیوروں کے سُن کر یہ ورق اُلٹ دیجئے ۔ جس شیر نے ایک دو نہیں، چھ چھ ضخیم دیوان کہہ ڈالے اس کے

کلام کا نمونہ بھی جی بھر کر پیش کرنے بیٹھئے تو شام سے صبح ہو جائے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے — ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی — حق بندگی ہم ادا کر چلے

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے — نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

میرؔ محض تغزل کے میر محفل نہیں مثنوی گویوں کے بھی امام ہوئے ہیں اور مثنویاں فارسی اردو ملا کر ایک دو نہیں، دس بیس کہہ ڈالی ہیں، کچھ ہجویں، کچھ مدح ہیں اور کچھ عاشقانہ۔ ہجو و مدح تو وقتی دلچسپی کی پھلجھڑیاں تھیں، چمک دمک آناً فاناً دکھا ختم ہو گئیں۔ حسن و عشق کے جذبات کی جڑیں انسان کے دل میں قائم ہیں۔ بہ قول حالیؔ

یہ وہ مضمون ہے کہ ہوگا نہ پرانا ہرگز

چنانچہ یہ پرانا مضمون آج بھی نیا ہے ——— ایک ہلکی اور بہت ہی ہلکی سی جھلک اس منظر کی ؎

عشق حق ہے کہیں نبی ہے کہیں — ہے محمدؐ کہیں علیؓ ہے کہیں

عشق عالی جناب رکھتا ہے — جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

یہ مثنوی معاملات عشق کے دیباچہ سے ہے۔ ۱۰، ۱۲ صفحہ کی مثنوی میں عشق کے سات معاملوں کا بیان ہے، گویا مسافر عشق کی داستان ہفتخواں۔

ایک صاحب سے جی لگا میرا — ان کے غمزوں نے دل ٹھگا میرا

چپکے منہ ان کا دیکھ رہتا ہیں — جی میں کیا کیا یہ کچھ نہ کہتا ہیں

دوسری منزل۔ سراپائے یار۔

ایک جاگہ سے ایک جاگہ خوب — پیکر ناز اس کے سب محبوب

ان لبوں سے جو کوئی کام رکھے　　قند و مصری کو کیوں نہ نام رکھے

تیسرے اور چوتھے مرحلہ میں وقتی معاملہ بندیاں ہیں۔ پانچویں منزل اشتیاق و آرزوئے وصل کی ہے ؎

دوستی رابطہ وفا اخلاص　　ساتھ میرے تھا اُنکو رابطہ خاص
ہیں تقاضائے ملنے کا رہتا　　مختلط ہونے کو سدا کہتا!

چھٹے موقعہ پر سابقہ خواب اور خواب پریشاں سے پڑا ؎

شب کٹی صورت خیالی سے　　دن کو ہوئیں شکستہ حالی سے

ساتویں منزل وصل اور پھر معاً فراق کی ؎

بارے کچھ بڑھ گیا ہمارا ربط　　ہو سکا پھر نہ دو طرف سے ضبط
شوق کا سب کہا قبول ہوا　　یعنی مقصود دل وصول ہوا

مگر اس کے بعد ہی ؎

ہو گئے بخت اپنے برگشتہ　　پھر گیا آسمان سرگشتہ
بات ایسی ہی اتفاق پڑی　　کہ ہوئی سر پہ فرقت آن کھڑی